Rāshdī, Ḥisām al-Dīn
Sindhī adab

پاکستان پمفلٹ نمبر ۶

ہماری دیگر مطبوعات

مشرقی پاکستان کے اردو ادیب

اردو زبان کی ترقی میں بنگال کا معقول حصہ رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے لے کر قیام پاکستان تک بنگال نے اردو ادب انشا کے ارتقا میں کیا حصہ لیا ہے۔ اس کا حال معلوم کرنے کے لئے اس کتابچہ کا مطالعہ کیجئے۔ اس میں نساخ۔ نواب سید محمد آزاد۔ خواجہ عتیق اللہ شیدا اور شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں و دیگر شعراو ادبا کا تذکرہ ہے۔ قیمت ۱۲ ار

پشتو ادب

صوبہ سرحد کی ادبی اور لسانی زندگی کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ پشتو زبان کی خصوصیات کیا ہیں۔ پشتو ادب کتنا قدیم ہے۔ اس میں کن تحریروں کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس کے گیتوں میں اس کی ثقافت کی کتنی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور قدیم عہد سے لے کر اب تک اس زبان میں کون کون سے بڑے شاعر اور اہلِ قلم پیدا ہو چکے ہیں، ان سب باتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہو گی۔ قیمت ۱۲ ار فی جلد

پاکستان کی عوامی کہانیاں

پاکستان کی سرزمین نے بہت سی دلکش کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ کہانیاں اگرچہ پاکستان کے مختلف علاقوں کی متنوع زندگی کی آئینہ دار ہیں مگر ان کی قدریں مشترک ہیں۔ ان کے کرداروں کو آپ اس ہمہ گیر اور وسیع قومی تہذیب کا نمائندہ پائیں گے، جیسے پاکستان کے روپ میں نئے سرے سے استقلال نصیب ہوا ہے۔ قیمت ۱۲ ار

ملنے کا پتہ:- **مینجر ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی**

(۳) مدح، مولود، مناجات۔ اس کی ایجاد کا سہرا سرفراز خاں اور رحمن چارٹ وغیرہ کے سر ہے۔ یہ صنفیں زیادہ تر عورتوں میں مقبول ہیں۔ کافی اور دوہا ان کے لئے معیوب ہیں۔ اس لئے وہ ان اصناف سے اپنا دل بہلاتی ہیں یہ صنفیں۔ حمد۔ نعت۔ مدح غوث پاک اور پنجتن پاک کی تعریف کے لئے مخصوص ہیں۔

(ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی)

ڈھور ڈنگر چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتے ہیں تو جنگل میں
بھی دوہا ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔ دیہاتیوں کے چوپال بھی
رات کو اس کے ترنم سے گونجتے رہتے ہیں۔ حسن اور عشق کے
مابین پیغام رسانی کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ عمر ماروئی۔ مومل۔
مینڈھیرو۔ سوہنی مہینوال۔ ہیر رانجھا کی داستانیں اسی صنف
میں محفوظ کی گئی ہیں۔

(۲) **وائی کافی**۔ اس صنف کو شاہ لطیف نے ایجاد کیا۔
بعد میں اس کا نام کافی ہو گیا۔ اس کے بھی خاص سُر ہوتے ہیں
اور مختلف اوزان ہیں۔ یکی۔ سوائی اور ڈیڈی۔ اگر اس کو
سندھی ادب سے نکال دیا جائے تو اس میں کچھ بھی باقی نہیں
رہتا۔ یہ غزل کے مقابلے کی چیز ہے اور سندھی کے لئے بالکل
موزوں ہے۔ اسی لئے گو آج تک غزل کو اس میں رائج کرنے
کی کوشش جاری ہے۔ پھر بھی اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ کیونکہ
سندھی زبان اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ
جب سے ایرانی اصناف سندھی ادب میں آئیں اسی وقت
سے ان کا تعلق عوام سے ٹوٹ گیا۔ ان میں سندھی عوام کے
جذبات کی ترجمانی کی صلاحیت موجود نہیں۔

اس میں سات شعر بڑھا کر وسیع کر دیا۔ ڈوھیڑے کے پھر کئی اقسام ہیں۔

لوڑاڈ:۔ جس میں عشق اور حسن کی باتیں ہوں۔

سلوک:۔ جس میں تصوّف اور پیر طریقت کی باتیں ہوں۔

ڈور:۔ جس میں اسلامی واقعات اور حضور صلعم کی تعریف ہو۔

سنگار:۔ جس میں پنجتن پاک اور خلفائے راشدین کی تعریف ہو۔

ھُنر:۔ جس میں معمہ کے اشعار ہوتے ہیں اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) سرائیتی (۲) دوراڈ (۳) ڈٹھ

یہ ڈھیرے مختلف سُروں میں کہے جاتے ہیں۔ کان پر ہاتھ رکھ کر بھی گائے جاتے ہیں اور کافی کے ساتھ بھی۔ کافی کا ایک شعر کہہ کر پھر اسی شعر کے ہم معنی ایک دوہا درمیان میں لایا جاتا ہے اس کے بعد پھر کافی کا ایک شعر پھر دوہا اسی طرح پوری کافی ختم ہوتی ہے۔ یہ وہ عوامی شعر ہے جس کے بغیر دیہاتی زندگی کا کوئی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔ جب چرواہے شہروں میں دودھ بیچ کر اپنے قصبوں کو لوٹتے ہیں تو اسی کو گاتے ہوئے آتے ہیں۔ زمین جوتنے کے بعد جب کاشتکار تھک کر سایہ میں ذرا سستانے بیٹھ جاتا ہے تو اس وقت بھی دوہا اس کی تھکن کو دور کر کے تازگی پہنچاتا ہے۔ رات کے آخری حصّہ میں چرواہے جب اپنے

آٹھواں باب

سندھی کی اصنافِ سخن

جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں بتا آئے ہیں۔ غزل، رباعی، قصیدہ وغیرہ یہ سب بیرونی اصناف سخن ہیں جو ٹالپوری عہد میں یا اس سے کچھ پہلے فارسی اثرات کی وجہ سے سندھی ادب میں داخل ہو گئیں۔ ورنہ خالص سندھی شعر مندرجۂ ذیل اصناف میں کہا جاتا تھا۔

(۱) ڏوهيڙو۔ ڏوهڙو۔ ڏوهو۔ اس کا نشان سب سے پہلے ہمیں "قاضی قاضن" کے یہاں ملتا ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی شعر ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ سندھی کا شعر دوہے کی صورت میں شروع ہوا ہو گا۔ "قاضی قاضن" سے شاہ کریم تک دوہا ہوتا تھا شاہ عنایت اور شاہ لطیف نے

پانی کے دھارے بہیں گے۔ بادبان کے کالے کالے سائے
نظر آرہے ہیں مجھے کسی کی یاد آرہی ہے، گھپ اندھیرا چھایا ہے۔
آہستہ آہستہ کشتی کو چلا۔
دیس چھوڑکر پردیس کی طرف چل رہے ہیں۔کسی نے نہ روکا اور
کسی نے نہ ٹوکا۔کسی کے ساتھ دل کی بات بھی نہ کہہ سکے۔ اب
دل پھٹ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ کشتی کو چلا۔)
شیخ صاحب نے گیتوں کو سندھی شاعری میں رائج کیا ہے،
"ملّاح کا گیت" اور" ماغی" وغیرہ ان کے بہترین گیت ہیں۔
عام شاعری پر غزل کی حکومت ہے۔ سندھ کی خالص
اور قدیم شاعری کا علمبردار سیّد محمود شاہ ٹھلّاہی ہے۔جس کی
کافیاں بڑی عزّت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور جسے زبان پر بڑی
قدرت حاصل ہے۔

جٺين جٺين بديڙي نوڏا ڪائي
پل پل تئين پاسا بدلائي
ڪاري ڪاري رات   هوريا هوريا ونجهه هلاءِ

× × ×

وهندا ڏار ڪهندا تار
سڙهه جا پاچا ڪارا ڪارا
آيا پل پل ياد پيارا
اوندهه جا چمڪاٽ   هوريا هوريا ونجهه هلاءِ

× × ×

ڏيهه ڇڏي پرڏيهه هليا سين
ڪهن نه جهليا سين ڪهن نه پليا سين
ڪهن سان دل جا گجهه نه سليا سين
دل تي ڪا ئي ڦاٽ   هوريا هوريا ونجهه هلاءِ

× × ×

(گھاٹ بہت دور تو نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ کشتی کو چلا۔ پانی کا سینہ چھلک رہا ہے جیسے جیسے کشتی ہچکولے کھا رہی ہے اور جیسے جیسے پہلو بدل رہی ہے۔ کالی کالی سطح پر آہستہ آہستہ کشتی کو چلا۔

چنڊ چوڏس جو ڇم ڇمڪارُ　　　سهڻو من مهڻو دل پيارو
مانڻ مرڻ ۾، جبل جهنگن ۾　　　پکين وڻن ۾ گهرن برن ۾
چپ چوڌاري ننڊ نرم ناري　　　پر مون نير وهايا
اڃهي چاڻ مسافر آيا

(بہت خوبصورت رات، چودھویں کے چاند والی رات دیکھیے چاند نے پگڈنڈیاں تک روشن کر دی ہیں ابھی ابھی مسافر واپس آیا چاہتے ہیں۔

چودھویں کا چاند دیکھیے کس طرح چمک رہا ہے۔ بہت خوب صورت اور دل لبھانے والا ہے۔ جنگلوں میں، پہاڑوں پر، پرندوں کے گھونسلوں میں، صحراؤں میں ایک چپ اور خاموشی چھا گئی ہے، عورتیں مرد سب کے سب میٹھی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ ایک میں ہی ہوں کہ ایسے میں جاگ رہی ہوں اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرا رہی ہوں۔ لیکن ابھی ابھی تو مسافر واپس آیا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ نظم بہت ہی مرصّع اور نیا رنگ لئے ہوئے ہے۔

شیخ ایاز کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

آه ڪري ته نه گهاڻ　　　هورياں هورياں ونجهه هلاءِ
پاڻيءَ جي ڇاتي ڇلڪائي

سیّد موسوی "تذکرہ لطفی مصنفہ لطف اللہ بدوی اور" لطف اللطیف" مولانا دین محمد صاحب وفائی۔ یہ سب قابل قدر ادبی اور علمی تصانیف ہیں۔

تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھنے والوں میں علامہ داؤد پوتہ، ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ۔ سیّد حسام الدین راشدی۔ مولائی شیدائی اور لطف اللہ بدوی قابل ذکر ہیں۔ ادبی مضامین میں سید عطا حسین شاہ موسوی۔ عبداللہ عبد۔ شفیع محمد علوی۔ خالد صاحب گڑھی یاسین وغیرہ اچھے لکھنے والے ہیں۔ افسانہ نویسی میں بھی ہمارے نوجوان بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ ساقی سجاولی۔ سلیم ہالائی۔ جمال الدین ابڑو اور ابن حیات کامیابی کے ساتھ فن کو نباہ رہے ہیں۔ شعرا میں حافظ محمد احسن۔ محمد خاں غنی۔ خیر محمد نظامانی۔ قادر بخش بشیر اور محمّد زمان طالب کے نام قابل ذکر ہیں۔

سیّد عارف گیلانی اور شیخ ایاز نے اپنے لئے نئی راہیں اور نئے مضامین تلاش کر لئے ہیں۔

سیّد عارف کا رنگ یہ ہے :۔

رات سونهاري چوڏهين واري   چنڊ چار ا چمڪايا

اڄ ڀي چاڙ مسافر آيا

ہے اور کئی ایک دوادین تصحیح اور ترمیم کے ساتھ مرتب ہو رہے ہیں۔
اس کے علاوہ کئی انجمنیں اور جماعتیں اپنے اپنے طور پر کام کر رہی ہیں۔
مثلاً "مسلم ادبی سوسائٹی حیدرآباد" "سندھی سدھار۔ سوسائٹی لاڑکانہ"
"سندھی ادبی سوسائٹی کراچی" "بزم خلیل حیدرآباد" "محفل احباب
کراچی" "بزم نظامی کراچی" "بزم ادب شکارپور" "آفتاب ادب
دادو" "انجمن علم وادب ہالہ" "سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی" اور
"انڈس اکیڈمی کراچی" ان میں بعض تحقیقی کام کر رہی ہیں اور بعض
فقط مشاعروں اور مقالوں کے ذریعہ شعروادب کی خدمت
بجا لا رہی ہیں۔

ادبی اور علمی رسائل کچھ تو پرانے ہیں اور کچھ نئے نکلے ہیں۔
لیکن سبھی اچھی طرح چل رہے ہیں۔ "توحید" "نئین زندگی" "فردوس
ہالہ" "سارنگ" "قلیچ" "پرہ ڦٽيي" "اساڃي منزل" "مبلغ"
وغیرہ میں سے بعض ادبی ہیں اور بعض علمی و تحقیقی مضامین شائع کرتے ہیں۔

ان چند سالوں میں کئی ٹھوس قسم کی تحقیقی اور تاریخی کتابیں بھی
شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً "بیلاین جا پول" مصنفہ ڈاکٹر نبی بخش خاں
بلوچ "سگندا" مصنفہ سید عبدالحسین شاہ موسوی "کھہ کتوری"
مصنفہ شیخ "ویجھار" مصنفہ عبدالکریم سندیلو "کیچ کو ڈیون"

ساتواں باب

موجودہ پاکستانی دور

(۱۹۴۷ سے اب تک)

موجودہ دور کی ابتدا پاکستان کے قیام سے ہوتی ہے۔ اس میں نوجوان لکھنے والوں کی خاصی جماعت پیدا ہوگئی ہے۔ ادبی انجمنیں قائم ہوئی ہیں۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ تنقیدی اور علمی مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔ کئی ایک علمی و ادبی رسالے بھی نکلنے لگے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ ہماہمی اور تیزی قائم رہی تو چند ہی سالوں میں سندھی ادب کی ایک نئی دنیا آباد ہو جائے گی۔

سندھ گورنمنٹ نے ایک ادبی انجمن قائم کی ہے جس کے زیر اہتمام سندھی لغت تیار ہو رہی ہے۔ سندھ کی تاریخ لکھی جا رہی

ذریعے علم و ادب اور تاریخ کی بے مثل خدمت کرتے رہے۔ گربخشانی نے شاہ عبد اللطیف کے رسالہ کو تحقیق کے ساتھ جدید طرز پر اڈیٹ کیا اور کئی اور کتابیں بھی لکھیں۔ جیٹھمل پرسرام آبجھانی نے نثر نویسی کا نیا انداز اور زبان کا نیا اور دل نشین پیرایہ نکالا۔ کئی کتابیں لکھیں ان کی نثر نظم سے زیادہ شیریں اور دل کش ہوتی تھی۔ لال چند امرڈنہ مل بھیرومل مہرچند کی تمام زندگی سندھی ادب کی خدمت کرتے ہوئے گذری۔ علّامہ داؤد پوتہ نصف صدی سے اپنی علمی تحقیقات کے ذریعہ سندھی ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ خان بہادر محمد صدیق میمن اور مولانا حیشتی بھی اسی دور کے ممتاز اہلِ قلم ہیں۔ پیر علی محمد راشدی بھی اسی دور کے بلند پایہ اخبار نویس اور سندھی کے مقبولِ عام نثر نویس ہیں۔

بینڈ اور باجے بجایا کرے گا۔

آخری دور کے شعراء:۔ انگریزوں کے آخری دور یعنی بیسویں صدی کے نصف تک کے شعرا یہ ہیں۔ جن میں سے کئی ابھی زندہ ہیں اور شعر و سخن کی خدمت کر رہے ہیں۔

محمد صدیق مسافر، نواز علی نیاز، حاجی محمود خادم، محمد بخش واصف، مولوی احمد ملاح، مولوی ثنائی، حیدر بخش جتوئی، مراد علی کاظم، جمعہ خان غریب، علی محمد قادری مرحوم، غلام سرور قادری مرحوم، غلام احمد نظامی مرحوم اللہ بخش عقیلی سرشار، غلام علی سرور، محمد ابراہیم خلیل۔

نثر نویس:۔ ($\frac{۱۸۴۹}{۱۲۶۶}$ - $\frac{۱۹۲۹ء}{۱۳۴۸ھ}$) اس دور کے نثر نویس یہ ہیں:۔

مرزا قلیچ بیگ مرحوم، انہوں نے ابتدائی دور میں سندھی ادب کی بے مثل خدمت کی۔ ہر قسم کی کتابیں لکھیں اور ہر زبان سے ترجمے کئے۔ تقریباً ۳۰۰ کے قریب کتابیں لکھ کر سندھی ادب کا دامن بھر دیا۔ حکیم فتح محمد سیوستانی مرحوم نے بھی نثر میں اچھی کتابیں لکھیں۔ مولانا دین محمد وفائی مرحوم (المتوفی ۱۹۵۰ء) نے سندھ کی تاریخ پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے۔ تاریخی ذوق اور تاریخ نویسی کی جدید طرز انہوں نے سندھ میں رائج کی۔ علمی و ادبی رسالہ "توحید" کے نام سے ۱۹۲۳ء سے اب تک نکالتے رہے جس کے

تاریخی قطعے کہے۔ میاں بخشی نے بہت ہی سخت قافیے استعمال کئے ہیں اور سخت زمینوں میں شعر نکالے ہیں۔

ہجو یہ اشعار محمدؐ ہاشم مخلص اور مولوی نور محمد نظامانی نے لکھنے شروع کئے۔ یہ دونوں حضرات اخبار نویس بھی تھے۔ ایک کا اخبار "مسلمان" اور دوسرے کا "طیراً ابابیل" تھا۔ ان دونوں نے ہجو گوئی میں کمال کر دیا۔

اکبر الہ آبادی کا رنگ سب سے پہلے شمس الدین بلبل نے اختیار کیا۔ طنزیہ شاعری کے بے مثل نمونے پیش کئے۔ چنانچہ آج تک سندھ اس کا ثانی پیدا نہیں کر سکا۔ اس نے اپنا دیوان مرتب کیا اور "نیچرل کریما" لکھی اس کا رنگ یہ ہے۔

غافل وڃين ولايت لئون ليڊيءَ سان لائيج
سو قرب کئون ڪرستان وڃي چرچ ۾ چوائيج

سک ناچ راڳ تنهجو پڻ بينڊ باجو بلڪل
پوءِ خوب بڻبي بابو بينڊ هٿ بجائيج ۔ الخ

(اے غافل ولایت جا اور کسی لیڈی سے جا کر عشق لڑا وہاں جا کر اپنے آپ کو کرسٹان کہلا اور ناچ گانے بھی سیکھ۔ جب وطن آئیگا تو ایک بابو سے زیادہ حیثیت نہ پائے گا اور پھر یہاں بھی فقط

ساتھ کس طرح کاٹے گی)

سندھ کا مشہور ہجو گو شاعر اور اخبار نویس محمد ہاشم مخلص ان کا بیٹا تھا۔ غالباً سب سے پہلے ہجویہ شاعری کا آغاز حافظ نے کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے محمد ہاشم اور پھر نور رنظامانی اور شمس الدین بلبل نے یہ رنگ اختیار کیا۔

پیر غلام شاہ راشدی۔ (المتوفی ۱۹۰۱ء/۱۳۱۹ھ) سوز و گداز اور زبان کی شیرینی ان کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جو کچھ کہا ہے وہ سب کا سب انتخاب ہے۔ اس لحاظ سے وہ آنسوؤں کا بادشاہ مانا گیا ہے۔ ممکن نہیں کہ ان کا کلام سن کر دو چار آنسو نہ گر جائیں اور دل میں گداز نہ پیدا ہو۔

دوسرے نامور شعرا۔ اس دور کے دوسرے نامور شعرا یہ ہیں:۔

میاں علی نواز علوی، پیر رشد اللہ شاہ جھنڈیوالہ، سیّد امیر علی شاہ نامرائی، ہدایت علی شاہ نجفی، مرتضائی ٹھٹھوی، غلام محمدؐ شاہ گدا۔ بیرل فقیر اور میاں خیر محمدؐ۔

تاریخ کا استخراج بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ ہدایت علی شاہ نجفی۔ میاں مرتضائی۔ غلام محمد شاہ گدا اور قلیچ بیگ نے

کی داستان بیان کر کے پھر تنزل کا نقشہ اور اس کے اسباب لکھے ہیں۔ آخر میں سندھی مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور جو قومی تحریکیں سندھ میں چل رہی تھیں ان کا تذکرہ کر کے تعلیم کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سلسلہ میں یہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کو سراہا ہے۔

حافظ حامد ٹکھڑائی۔ (المتوفی ۱۸۹۷ء / ۱۳۱۵ھ) تیس برس کی عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ دوہے، کافیاں، مدحیں، سی حرفیاں، مثنویاں اور ہجویں لکھی ہیں زبان پر بہت قدرت ہے انداز بیان بھی بے حد دل کش ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ۔

عمر لاهِ عاجزِ تان ظالم زنجير ڏي موڪل ته مارن ملان منجهه ملير
سنگهارن کي سڪندي ٿيم سال ڪئي ڏوٿين جبي ڏسڻ جبي اندر ڪيا اکير
السنا اُتي جن سان مون من مٺهيو هتي ساڻ ٿو ڪيئن هري سوچير

(اے عمر عاجز کی زنجیریں کاٹ دے تا کہ ملیر جا کر اپنوں میں آسودہ ہو جائے۔ ہم وطنوں کے لئے تڑپتے ہوئے سال بیت گئے ان کے دیکھنے کی دل میں بے انتہا آرزو اور کشش ہے۔ روز ازل سے ہی جن کے ساتھ روح اٹکی ہوئی ہے بھلا یہ تو انصاف کر کہ وہ یہاں تیرے

الفاظ باندھے ہیں جن کی وجہ سے شعر میں ترنم پیدا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی زورِ بیان بھی۔

اللہ بخش ابوجھو۔ (المتوفی ۱۹۰۱ء / ۱۳۱۹ھ) سندھی کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قومی اصلاح کے لئے خواجہ حالی کی طرح مسدس لکھی۔ یہ وقت وہ تھا جب چند درد دل رکھنے والے مسلمانوں نے قومی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ چند جماعتیں بنائی گئی تھیں ایک دو مدرسے قائم کئے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں سندھ مدرسہ کی بنیاد بھی پڑی تھی۔ حسن علی آفندی مرحوم سندھی مسلمانوں کی پستی اور سرکاری دفاتر میں ان پر ملازمتوں کے دروازے بند دیکھکر انگریزی تعلیم دلانے کی تحریک چلا چکے تھے۔ مرحوم مولوی اللہ بخش بھی انہی کے ساتھیوں میں سے تھے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے انہوں نے کراچی میں اپنے طور پر ایک اسکول کھولا۔ جس کی صدر مدرس ان کی صاحبزادی شاہ بی بی ہوئیں۔ مسلمان لڑکیوں کو بھی تعلیم کی ترغیب دینے کا کام اسی مدرسہ کے ذریعہ شروع ہوا۔

یہ حالات تھے جن سے متاثر ہو کر مولوی صاحب نے اپنی مسدس لکھی جو یہاں بھی اسی طرح مقبول اور اثر انداز ہوئی جس طرح مولانا حالی کی مسدس ہندی مسلمانوں میں مسلمانوں کی اقبال مندی

تھے۔ سندھی نثر کا خاص انداز اختیار کیا، عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی جس میں ایک ترنم کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کا ایسی ہی نثر میں "گل خنداں" کے نام سے ترجمہ کیا۔ آج تک سندھی میں اس پایہ کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ انداز بیان کی دل کشی کے سبب اصل سے بھی بڑھ گیا ہے۔

اسی دور میں اردو کی دوسری مشہور داستانوں کے تراجم بھی سندھی زبان میں ہوئے۔ چہار درویش اور حاتم طائی کا ترجمہ حاجی امام بخش نے کیا۔ واهين ءِ وليهين جو داستان "چوسٹھ چنڈ" کا قصہ بھی ترجمہ ہوا لیکن زبان اور انداز بیان کی وجہ سے جو "گل خنداں" کو قبول حاصل ہوا وہ ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔

ہز ہائینس میر عبدالحسین سانگی۔ (۱۸۵۱ / ۱۲۶۸ – ۱۹۲۴ء / ۱۳۴۸ھ) سندھ کے حکمران خانوادۂ تالپور کا چشم و چراغ تھے۔ میر عباس علی خاں ان کے والد کا نام تھا جو آخری فرماں روا میر نصیر خاں کے نور نظر تھے یہ بنگال میں انگریز بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۳ء میں اپنے وطن لوٹے سندھی، فارسی اور اردو میں شاعری کی اور ادب میں اپنے لئے ایک جگہ پیدا کرلی۔ سندھی غزل میں ان سے بہتر کوئی شاعر نہیں گذرا۔ دیوان کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ شعر میں کھنکتے ہوئے

ہیں۔ محمد قاسم ہالائی، غلام محمد شاہ گدا، مرزا عباس خورشید دہلوی، حافظ عبداللہ معذور، آخوند محمد لقمان شیرانی، آخوند لطف اللہ شیرانی، آخوند فقیر محمد شیرانی عاجز، میاں محب علی محب، سندھ سدھار، مجمع محمدی، اخبار اکلیل، معین الاسلام، معاون اسلام اخبار ان مشاعروں کا انتخاب شائع کرتے تھے۔ ہزہائینس میر حسن علیخان اور میر عبدالحسین خاں سانگی بھی ان مشاعروں کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے۔ الغرض سیّد صاحب کی وجہ سے حیدرآباد اس وقت سندھی ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ اخبار مفرح القلوب فارسی شعرا کی طرحی غزلیں شائع کرتا تھا اور ان صفحات پر گویا فارسی مشاعرے ہوتے تھے۔ سیّد صاحب اس اخباری مشاعرہ میں بھی حصّہ لیا کرتے تھے انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ دیوان ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۴ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۸۳ء میں ورنیکلر سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا۔ سندھی شعرا کے حالات اور انتخاب پر بھی سیّد صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۸۷ء میں اسی سوسائٹی کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ غالباً یہ سندھی شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔

آخوند لطف اللہ ولد محمد اسحٰق قریشی۔ (۱۲۵۸ / ۱۸۴۲ - ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء)

حیدرآباد سے متصل ٹنڈو کھیانتے میں شیرانی آخوندوں کے محلہ میں رہتے

گردنیں کٹ کے گریں اور کتنوں کے ہاتھ پاؤں الگ ہو گئے۔ زمین سے ایسا گرد و غبار اٹھا کہ تمام فضا تیرہ و تار ہوگئی اور اس میں تلواریں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے تاریک رات میں بجلی۔

سندھی نثر اور نظم میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ۸۵ برس کی عمر میں ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔

مصری شاہ بن سید بلند شاہ نصرپوری۔ (۱۸۲۵ / ۱۲۴۲ - ۱۹۰۸ء / ۱۳۲۶ھ)

کلہوڑہ عہد کے مشہور شاعر شاہ عنایت رضوی کے خاندان سے تھے۔ ان کی شاعری بہت ہی نازک نرم۔ دل نشین اور سوز و گداز لئے ہوئے ہے۔ یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ان کے کلام کو اب تک مقبولیت حاصل ہے۔

فاضل شاہ بن حیدر شاہ حیدرآبادی (۱۸۳۶ / ۱۲۵۲ - ۱۹۰۰ء / ۱۳۱۸ھ)

حیدرآباد میں قیام رہا وہیں انتقال کیا۔ شہر کے قاضی تھے۔ وکالت بھی کرتے تھے۔ اُن کی وجہ سے حیدرآباد میں شعر و سخن کا بہت چرچا رہا۔ مشاعرے انہی کی کوششوں سے منعقد ہوتے تھے۔ قاضی امام علی پاٹائی بھی جو اس وقت تحصیل دار تھے ان کے دوست اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے انہیں کے مکان پر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے اور بہت سے شعرا حصّہ لیتے تھے۔ جن میں سے ان کے نام قابلِ ذکر

ہز ہائینس میر حسن علیخاں ٹالپور۔ (۱۸۲۴ء / ۱۲۴۰ھ - ۱۹۰۹ء / ۱۳۲۴ھ) سندھ کے آخری تاجدار میر نصیر خاں کا فرزند تھا۔ ٹالپور کے مفتوح ہونے کے بعد جو قافلہ ٹالپور خانوادہ کا پونہ اور کلکتہ گیا تھا۔ یہ شاہزادہ بھی اس میں چلا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں وہاں سے اپنے وطن حیدرآباد واپس آیا۔ آخوند محمد قاسم ہالائی اور سید غلام محمد شاہ گدا ان کے استاد تھے۔ سندھی میں غزلیں، سلام، مراثی، قصائد وغیرہ بھی کہے۔ لیکن ان کا شاہکار، "**شاہ نامۂ سندھ**" ہے۔ وہی شاہنامہ کا ساز در بیان اور شکوہِ الفاظ موجود ہے۔ کلہوڑوں اور ٹالپوروں کی باہمی رزم آرائی ملاحظہ ہو۔

وڙهيا جئين وڙهن شينهن اڙدها	ٻيو اُن کان سوا، نه هن کا وڙهڻ
ائين نعره زن ٿيا ٿي بازور شور	بڌڻ واري چا تو سو محشر جو شور
ٿيا گرد ڪان ودجي گهٽان سر جدا	گهٽا ويا ٿي انو قت ٻي دست وپا
زمين کان اٿيو اهڙو تيره غبار	فضاء هوا جهن ڪئي تار بيڪو تار
انهيءَ گرد ۾ ائين ٿي چمڪيا هٿيار	ٿي جئين برق چمڪي بہ شبہائے تار

(شیر اور اژدہا جیسے لڑیں۔ اسی طرح آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑنے کے سوا ان کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا اور اس زور شور سے نعرے لگ رہے تھے کہ سننے والوں نے سمجھا عرصۂ حشر بپا ہے۔ کئی

(۲) قسمت واري ڪوٽ ۾ ماڪيڙ ون تون ... او عمر چا ۾ امير
گارُوٽون هٿ تو ڳاري

(۳) ابائڻ جي آسري ميان ... او سوئي ٿيٺ ۾ لير
پٽ پنوهر جي شل پاري

(۴) بيڪس وَسِ ناهن ورڻ پيچن جي ... او توڙئون لکي تقدير
ڪيرُ ڪِئي ڪي تو ٽاري

(میکے کی یاد رات دن رُلا رہی ہے۔ میں تو یہاں کوٹ میں بند پڑی ہوئی ہوں اور وہ لوگ ہنس ہنس کر دودھ پی رہے ہیں۔ کتنی اندوہناک بات ہے۔ میری روح تو انہیں سے اٹکی ہوئی ہے۔ بس قلعہ میں قسمت نے آکر بند کر دیا ہے۔ اے عمر! بہت ہی اچھے امیر اس سے تو مجھے نکال دے۔ یہاں ہولے ہولے میرا جسم میرا بدن اور میری روح تحلیل ہو رہی ہے۔ میکے والوں کے انتظار میں تو میری اوڑھنی جو وہاں سے لائی تھی تار تار ہو رہی ہے۔ خدا ہی ہے جو اس کی لاج رکھ لے۔ کہیں مجھے یہاں کی اوڑھنی نہ پہننی پڑے۔ اے بیکس! میں کیا بتاؤں۔ میرے میکے والوں کے اختیار میں کوئی چیز نہیں۔ ورنہ وہ کہیں اس طرح بیٹھ جاتے۔ یہ تو تقدیر کی بات ہے۔ جو لکھا جا چکا ہے۔ وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا)۔

قادر بخش بیدل روہڑی۔ (۱۸۱۴ء/۱۲۳۰ھ - ۱۸۷۲ء/۱۲۸۹ھ) یہ بہت

بلند پایہ صوفی شاعر ہیں۔ ان کا درجہ اس دور میں وہی ہے جو پچھلے ادوار میں شاہ کریم، شاہ لطیف اور سچل سرمست کا ہے۔ فارسی دیوان اور تصانیف کے علاوہ سندھی اشعار کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کی مقبولیت ان کی سندھی شاعری کی وجہ سے ہے۔ زیادہ تر رنگ سچل سرمست کا ہے۔ معتقد بھی انہیں کے تھے۔

اخوند محمد قاسم بن نعمت اللہ لائی (۱۸۱۹/۱۲۳۴ - ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ)

زیادہ تر زندگی حیدر آباد میں گذاری۔ فاضل شاہ وغیرہ سے طرحی مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں ان کا دیوان تیار ہوا اور ۱۸۷۸ء میں سندھ ورنیکلر سوسائٹی کے زیر سرپرستی ودیا ونود پریس کراچی میں شائع ہوا اس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔

محمد محسن بیکس روہڑی۔ (۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ - ۱۸۸۱ء/۱۲۹۸ھ) بیدل کا

خلف الرشید اور سندھی کا پرسوز شاعر تھا۔ جوانی میں انتقال کیا ان کی ایک کافی ملاحظہ ہو۔

ابائڻ جيئي اُڪير ر اتيو ڏينهن ٿي رُهاري

(۱) آءُ هت ماندي تن مارن رُئي او ڪليو پين هو ڪيرَ

ساهُ سنگهار ن ڪي ساري

جن میں زبان خالص، تشبیہیں اور استعارات مقامی، جذبات اور تخیّل گھریلو اور تصورات وغیرہ بھی اسی سرزمین سے والبتہ ہوتے تھے۔ لیکن اس دور میں یہ چیزیں بالکل ختم ہو گئیں۔ بیدل اور بیکس تک تو وہی پرانی روش قائم رہی۔ لیکن میر حسن علی خاں۔ میر عبدالحسین خاں۔ سیّد فاضل شاہ اور میرزا قلیچ بیگ نے ہٹ کر نئی راہ نکالی اور ایرانی تصوّرات کو سندھی شاعری میں داخل کیا۔ کوّے۔ مینا۔ کرڑ۔ کنڈی اور بھبّن۔ بھاٹن کے بجائے گل و بلبل اور سرو و صنوبر کو مسلّط کیا گیا۔ جس کی وجہ سے زبان خالص نہ رہی۔ تخیّل اور تصورات کا تطابق ماحول سے نہ رہا۔ تشبیہیں استعارے اور تراکیب وغیرہ اس ملک سے لائی گئیں جو سندھی عوام نے کبھی نہ دیکھا تھا اور ان کے لئے یہ صورت حالات بالکل مضحکہ انگیز بن گئی۔ سندھی عوام سے سندھی شاعری کا رشتہ ٹوٹ گیا اور شاعری فقط تعلیم یافتہ اور شہری خواص کی دماغی عیّاشی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی سندھی ادب پر یہ ایسی کاری ضرب تھی جس کے اثرات سے یہ آج تک جان کنی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ سندھی کی غزلیہ شاعری ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔

اس دور کے شعرا اور ادیب یہ ہیں :-

(۴) معین الاسلام کراچی ۱۸۵۵ء

(۵) معاون الاسلام " "

بیسویں صدی کے شروعات کے یہ اخبار ہیں :-

(۱) سندھ سدھار کراچی

(۲) الحق حیدر آباد اور سکھّر

(۳) آفتاب "

(۴) بہار اخلاق ٹکھڑ

(۵) الوحید کراچی

(۶) سندھ زمیندار سکھر

بیسویں صدی کے شروع میں علمی ادبی اور تاریخی رسائل کی بھی ابتدا ہوئی جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) تعلیم کراچی

(۲) الکاشف لاڑکانہ

(۳) توحید کراچی

ان تمام ترقیوں کے باوجود سندھی ادب اور شعر کو ایک عظیم نقصان بھی اٹھانا پڑا اور وہ یہ کہ اس سے پہلے سندھی شاعری خالص مقامی ماحول کی آئینہ دار ہوتی تھی دوہے، بیت اور کافیاں

جس کی ابتدا شمس الدین بلبل کے ذریعہ ہوئی۔

(۵) ہجویہ نظمیں بھی لکھی گئیں۔ جن میں محمد ہاشم مخلص اور نور محمد نظامانی پیش پیش ہیں۔

(۶) قصائد کی ابتدا بھی ہوئی چنانچہ میر عبدالحسین، ہدایت علی شاہ نجفی اور قلیچ بیگ نے قصائد لکھے۔

(۷) مشاعروں کی طرح بھی ڈالی گئی۔ پہلے اخبار مفرح القلوب کراچی (۱۸۵۵ء) کے ذریعہ اخباری مشاعرے شروع ہوتے۔ بعد میں میر دوست علی خاں، امیر عبدالحسین خاں اور سید فاضل شاہ کی کوٹھیوں پر منعقد ہونے لگے۔

(۸) کتابوں کی اشاعت اور طباعت کے لئے مستقل ادارے پیدا ہوئے اور اسلامی علوم کی کتابیں دھڑا دھڑ چھپنی شروع ہوگئیں۔

(۹) اخبارات اور رسائل کا اجرا بھی اسی دور میں ہوا۔ انیسویں صدی کے اخبار یہ ہیں:۔

(۱) مفرح القلوب کراچی ۱۸۵۵ء
(۲) مجمع محمدی ”
(۳) اکلیل ”

(۱۳) ۱۸۷۰ء میں میرزا قلیچ بیگ نے ہندی سے "خورشید" کا ترجمہ کیا۔

(۱۴) ۱۸۸۸ء میں دیوان کوڑیمل نے "رتناولی" کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد تصنیف و تالیف اور تراجم کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا اس دور کی ادبی خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلا مجموعۂ شعر دیوان کی صورت میں حروف تہجّی کی ترتیب سے ٹالپوری عہد کے آخر میں خلیفہ گل محمّد (۱۷۸۴-۱۸۵۶) نے مرتب کیا تھا۔ اس دور میں ہر شاعر نے اپنے کلام کی ترتیب دیوان کی صورت میں کی۔

(۲) مثنوی کی ابتدا فنّی طور پر اس دور میں ہوئی خاص طور پر رزمیہ شاعری کی۔ — ہز ہائینس میر حسن علی خاں (۱۸۲۴-۱۹۰۹ء) نے "فتح نامہ سندھ" کے نام سے کلہوڑا اور ٹالپور کی رزمیہ داستان لکھی اور سید غلام مرتضیٰ شاہ مرتضائی نے شاہ نامہ اور سکندر نامہ کا اسی بحر میں منظوم ترجمہ کیا۔

(۳) حالی کی طرز پر اصلاحی اور قومی نظمیں مسدّس کی شکل میں لکھی گئیں۔ اللہ بخش ابوجہ نے اس کی ابتدا کی۔

(۴) مزاحیہ، اصلاحی اور نئی تہذیب پر طنزیہ اشعار لکھے گئے

(۳) ۱۸۵۷ء میں دیوان نندی رام نے بچوں کی پہلی جماعت کے لئے "باب نامہ" لکھا۔

(۴) ۱۸۶۱ء میں دیوان نندی رام نے تاریخ معصومی کا فارسی سے سندھی میں ترجمہ کیا۔

(۵) ۱۸۶۱ء میں سید میراں محمد شاہ نے "مفید الصبیاں" کا ترجمہ کیا۔ یہ سب کتابیں فارسی اور ہندی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔

(۶) ۱۸۶۲ء میں رائے بہادر کوڑیمل نے "کولمبس کی تاریخ" کا ترجمہ کیا۔

(۷) ۱۸۷۰ء میں نول رائے نے "ایسب کی کہانیوں" کا ترجمہ کیا۔

(۸) ۱۸۷۰ء میں دیوان نول رائے اودھارام نے "راس بلاس" کا ترجمہ کیا۔

ان تراجم کے علاوہ ان ہی چند سالوں میں کچھ اوریجنل تصنیفیں بھی ہوئیں۔ مثلاً:-

(۹) ۱۸۶۴-۱۸۷۰ء تک کیول رائے نے تین کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) گل (۲) سوکھڑی (۳) گل شکر۔

ثانی الذکر کتاب سندھی کہاوتوں اور اصطلاحوں کے متعلق تھی۔ کچھ ناول اور ڈرامے بھی اس زمانہ میں ترجمہ ہوئے۔

(۵) سندھی انگریزی لغت مصنفہ آسٹیک ۱۸۵۵ء

(۶) انگریزی سندھی لغت " لکشمی وشنو پرا جپئی ۱۸۶۸ء

ان گراموں اور لغات کے ساتھ ساتھ درسی کتابوں اور تصانیف وتراجم کا کام بھی شروع کرا دیا گیا۔ دیوان پرتبھداس اندلام اور مرزا صادق علی خان بہادر سے نصاب کی کتابیں لکھوائی گئیں اور خود انگریزوں کے لئے بھی سندھی پڑھنا اور بولنا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں پہلا نارمل سندھی اسکول کراچی میں قائم کیا گیا۔ اور اسی سال جغرافیہ اور تاریخ میں تقریباً دس کتابیں سندھی زبان میں تیار کرائی گئیں۔ (سندھ گزیٹر ۴۷۴) ۱۸۶۰ء میں تعلیم کے لئے الگ محکمہ قائم کیا گیا۔

ان سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری طور پر بھی تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہو گیا اور اسی دور میں کئی کتابیں غیر سرکاری مصنفوں نے لکھیں۔ مثلاً:۔

(۱) ۱۸۵۲ء میں غلام حسین محمد قاسم قریشی نے "بمبھی زمیندار کی کہانی" لکھی۔

(۲) ۱۸۵۵ء میں سید میراں محمد شاہ نے "سدا نوری کدا توری" کا قصہ لکھا۔

کہ عربی فارسی خط میں ملا جلا کر لکھی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی
خالص آوازیں اور الفاظ اچھی طرح ادا نہیں کئے جا سکتے تھے جیسا کہ
شاہ کریم ابوالحسن سندھی اور شاہ لطیف کی کتابوں کی تحریر سے
معلوم ہوتا ہے۔ اس دقّت کو محسوس کر کے انہوں نے ٹالپوری عہد
میں ہی سندھی کی گرامر تو واآتھن صاحب کے ذریعہ ۱۸۳۶ء میں
بنوا لی تھی۔ لیکن خط کی مشکل ابھی باقی تھی۔ جس کو ۱۸۵۲ء / ۱۲۹۹ھ میں سر بارٹل
فریئر کے عہد کمشنری میں ایک کمیٹی کے ذریعہ حل کیا گیا۔ یعنی عربی
حروف تہجّی میں نقطے لگا کر خالص سندھی آوازوں کے لئے نئے الفاظ
ترشوائے گئے اور ملے ہوئے الفاظ بھ۔ ٹھ۔ تھ۔ پھ۔ وغیرہ کے
لئے ڀ۔ ٺ۔ ٿ۔ ڦ۔ ٻ۔ ٻ۔ ڊ۔ ڏ۔ ڙ۔ ڳ۔ ڱ۔ ڃ۔ ڄ
ڇ کی تختی بنائی گئی اور عربی کا خط نسخ رائج کر دیا گیا۔

واآتھن کی گرامر تو بن ہی چکی تھی۔ اس کے بعد چند اور بھی گرامریں
اور لغات تیار کرائے گئے۔ جن کا سلسلہ اس طرح ہے۔

(۱) گرامر	مصنّفہ	آیسٹوک	۱۸۴۳ء
(۲) گرامر اور لغت	؍؍	مسٹر لیچ	۱۸۴۳ء
(۳) انگریزی سندھی لغت	؍؍	آسٹیک	۱۸۴۹ء
(۴) گرامر	؍؍	؍؍	؍؍

چھٹا باب

عہدِ برطانوی کا ادب

۱۸۴۳ء / ۱۲۵۹ھ ——— ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۷ھ

ویسے تو انگریزوں کے قدم سندھ کے ساحل پر کلہوڑوں کے زمانہ ہی میں پڑ چکے تھے لیکن ان کی مستقل حکومت ٹالپوروں کے اختتام سے شروع ہوئی جبکہ ۱۸۴۳ء میں ٹالپوروں کی توڑے دار تفنگوں نے میانی کے میدان پر سر چارلس نیپئیر کی توپوں سے شکست کھائی۔

انگریزوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کے لئے فارسی کی عمل داری دفاتر سے اٹھادی اور سندھی زبان کا سکّہ چلا دیا۔ سندھی کی سب سے بڑی کوتاہی یہ تھی

اسی کوے سے خطاب ہے" تو سنو! آج اگر تو میرے محبوب کے آنے کی خوش خبری سنانے آیا ہے تو آ کر میری منڈیر پر آرام سے بیٹھ اور پھر اپنی پیاری بولی بول اور کہہ کہ آج صبح وہ آ رہے ہیں۔ اگر تو یہ کرے تو میں تیرا منہ مٹھائی سے بھر دوں)۔

خلیفہ نبی بخش لغاری۔ یہ اس دور کے اواخر کا عظیم الشان شاعر ہے۔ پیر صاحب پگاڑو سے بیعت تھی "سسی پنہوں" کی داستان کو ۱۲۵۰ھ میں قلم بند کیا اور حقیقت یہ ہے کہ سندھی زبان میں داستان نظم کرنے کا حق ادا کر دیتا ہے۔ حُسن و عشق کی یہ داستان جزئیات نگاری اور نازک خیالی کا شاہکار ہے خلیفہ نے اس کے علاوہ سندھی اور سرائکی کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے جس سے زبان پر اس کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں پہنچ گیا۔ کالے کالے بادل پچھم سے اٹھ اُٹھ کر سیاہ ہونے لگے تمام آسمان اور فضا سب کی سب کچھ تاریک سی ہوگئی۔ بجلیاں دیکھو! وہ بھی آپس میں ہنستی کھیلتی اور کودتی ہوئی آرہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سارنگ نے رنگ جمادیا اور تمّل کہتا ہے کہ پروردگار نے ہر ایک دیس میں پانی برسا کر جل تھل کر دئے۔ اب خوش حالی آگئی اور ملک سے قحط کا عذاب ٹل گیا)

وِڄ سگھو جان واءُ ڪانگل چيٽم قريب کي
توريءَ هاٽ تمل چوي جٽ مون نه جگاءِ
اڄي وري هند وساءِ توريءَ سيہ سيجا تيا

(کوے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے تو جلدی جا بلکہ ہوا کی طرح تیز جا اور محبوب کے پاس پہنچ کر کہہ کہ تمّل کا اب تمہارے بغیر جینا قطعی محال بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے آجاؤ اور ویرانوں کو آکر آباد کرو تمہارے بغیر تو ہر چیز اُجڑ گئی اور ماحول سونا سونا سا معلوم ہوتا ہے)

کَھہُ ڪانگل ڪر بات	اڄ عجيب اچڻ جي
اڄي ويھ اگڻ تي	لنئو سڀا جھبي لات
اچڻ هو ند تمل چوي	اڄ پرين پير پيات
تان ڪانگل تنهنجو وات	مصريءَ سان منو ڪريات

نيون، نياڻ نوندر ٿيون ڪرڪا ڪن ڪارا
وسي مينهن وسوڪيون چوڏس چوڌارا
ڏڪائي جا ڏيهه اٿيا موٽي متارا
حمل هر پارا آيون خبرون خير جون

(موسم آگیا کالے بادلوں کے دَل کے دَل امنڈ آئے اور آپس میں ٹکرانے لگے۔ جیسے کہ نقاروں پر چوٹیں پڑ رہی ہوں۔ بارشوں کو خدا کی طرف سے برسنے کی اجازت مل گئی۔ ندیاں، دادیاں اور نالے، نہریں۔ سب کے سب بہنے لگے۔ بادلوں نے برس کر ہر طرف جل تھل کر دئے۔ چرواہوں کے کمزور چوپائے بھی موٹے تازے ہو گئے۔ اے حمل اس وقت تو ہر طرف سے اچھی خبریں آرہی ہیں)۔

مند ٿي منڊل وڄيا ٿيو سارنگ سوايو
ڪارو روت رم ڪري اتر ون ٿي آيو
ڪڪر ڪارو نيار ڪري بادل بڻايو
ڪوٺيون اچن ڪيڏ نديون سارنگ رنگ لايو
حمل چوي هر ديس تي واحد وسايو
ٿيو سُڪر سڻائو لٿو ڏِرت ڏيه تان

(برسات کا موسم آگیا۔ نقارے بجنے لگے۔ سارنگ بھرپور جوانی

پاندِ ٻِپَسِي پويون پائنَ هارَ حمل چوي

(اے عمر میری وطن والیاں اور میکے والیاں وہیں کی بنی ہوئی اوڑھنیاں پہنتی ہیں۔ پانی دور دور سے وہ خود ہی جا کر بھر لاتی ہیں اور سر پہ رکھ کر لاتی ہیں۔ وہاں کی خودرو سبزیاں (ساگ سنگر) ان کی غذا ہیں اور انہیں سے پیٹ بھرتی ہیں اپنی جھولی میں ٹپسی (پھول) چن کر اسی کو پرو کر وہ ہار پہنتی ہیں)۔

الله اوٺي آڻ ڏاڏاڻي ڏيہ جو

خوشيءَ جون ڏي خبر ون حمل چوي هاڻ

آهيان ٻنهي ڏينهن اماڻ ين منهنجه مهمان

امانت اماڻ عمر اوڏا هين سيگهه و

(اے پروردگار وطن سے کوئی اونٹنی سوار آجائے اور مجھے میرے ماں باپ کے وطن اور وہاں رہنے بسنے والوں کی خیر خبر آکر سنائے۔ میں تو حقیقت میں صرف چند دنوں کے لئے تیری مہمان ہوں۔ اے عمر! یہ امانت خود تو ہی جن کی ہے ان کے پاس پہنچا دے)

مند ٿيي منڊل وچيا ڪڪر ٿيا ڪارا

آيا اتر يار ڏاهن بارير ى بارا

ميهن ڪي موڪل ٿيي پرور جي پارا

عوام میں ان کے شعر کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولود اور مدحیں بھی کہیں جو بہت مشہور ہوئیں۔

حمل فقیر لغاری

($\frac{۱۲۳۰}{۱۸۱۵}$ - $\frac{۱۲۹۶ھ}{۱۸۷۹ء}$) یہ سندھ کے بہت ہی مقبول عوامی شاعر ہیں اور شاہ صاحب کے بعد انھیں سب سے زیادہ قبول عام کا شرف حاصل ہے۔ ان کا خاندان ڈیرہ غازی خاں سے ٹالپوری عہد میں آکر خیرپور کے قریب خان پور میں آباد ہو گیا، اور وہیں یہ ۱۲۳۰ھ کے قریب پیدا ہوئے یہ اپنے آخری زمانہ میں سکرنڈ کے قریب قصبہ محمود خاں لغاری میں آ گئے تھے۔ جہاں ($\frac{۱۲۹۶ھ}{۱۸۷۹ء}$) میں انتقال کیا۔ بیعت کی نسبت پیر پگاڑو (غالباً پیر علی گوہر شاہ) سے تھی۔ سرائکی اور سندھی زبان میں بے مثل شاعری کی ہے۔ سرائکی میں "ہیر رانجھے" کی داستان ۱۲۶۳ھ میں لکھی جو بڑی مشہور ہے۔ سندھی دوہوں کا خزانہ بھی بے مثل ہے۔

ماروئی اپنے وطن کے تمدن کو عمر کے کوٹ میں یاد کرتے ہوئے کہتی ہے۔

عمر اباٹيي پار ڏي ۔۔۔ لس ہڏيون لوئيون

آٽن پہرۍ پنڌ تان ۔۔۔ آب پہرۍ اوئيون

کرن قوت کماحقہ ۔۔۔ ساگ سنگہ سويون

به شعر صنعت، صاحب اگر تو دم بزنی
بخلق یاد دہی معجزہ مسیحا را

کریما کا سندھی ترجمہ سب سے پہلے عبدالرؤف نے ۱۱۷۸ھ میں کیا اس کے بعد انہوں نے کیا جو پہلے سے زیادہ نفیس، شستہ اور شائستہ ہے۔

خلیفہ کرم اللہ شکارپوری۔ (المتوفی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) اپنے وقت کے جید عالم اور فارسی و سندھی کے بے مثل شاعر تھے بہت سا کلام ضائع ہو گیا لیکن جو کچھ دست برد زمانہ سے محفوظ رہا وہ بھی کافی ہے۔ "مینا اور کوے" کا مکالمہ مشہور ہے۔

پیر محمد اشرف قریشی کامارہ (ٹنڈو اللہ یار)۔ (المتوفی ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء) سندھی کا قادر الکلام شاعر تھا۔ قدیم طرز پر اور بہت ہی لطیف شعر کہے ہیں۔ نعت گوئی میں بھی کمال تھا۔

فتح محمد فقیر۔ (المتوفی ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء) تعلقہ گگر کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ایک زمانہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔ جس وقت انگریزوں نے حیدرآباد پر قبضہ جمایا اس وقت وہ وہیں موجود تھے۔ سید قنبر علی شاہ اور حضرت پیر پگاڑو سے عقیدت تھی۔ آخری عمر میں ٹھٹھہ کے قریب قصبہ بھاڑا میں جا کر مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔ کافیوں میں حسن و عشق کے مضامین کو بہت ہی کامیابی سے باندھا ہے۔

میں بے مثل ہیں۔ اس دور میں فتح فقیر اور پیر اشرف بھی دو معقول لغت گو ہوئے ہیں۔

اس دور کے دو درویش صفت ہندو بھی سندھی کے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

دیوان دلپت رائے صوفی سہوانی۔ (المتوفی ۱۲۵۷ھ)

اور بھائی چین رائے سامی شکارپوری۔ (المتوفی ۱۲۶۷ھ) سامی حضرت امین شاہ چشتی شکارپوری کا مرید تھا۔ کلہوڑوں اور ٹالپوروں کی کشمکش اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس کے کلام میں "خودی" کا سبق بڑے زور شور سے دیا گیا ہے۔

پیر علی گوہر شاہ اصغر (۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء — ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء) یہ حضرت پیر پگاڑو سوم تھے۔ ۳۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔ سوز و گداز ان کی کافیوں کا خاصہ ہے۔ رنگ اور انداز بالکل جداگانہ ہے۔ جو کچھ کہا ہے وہ انتخاب ہے۔

محمد عارف صنعت شکارپوری۔ (المتوفی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء)۔

فارسی کا صاحب دیوان شاعر ہے۔ خیمہ دوزی پیشہ تھا۔ ٹالپوری عہد میں کافی آمدنی تھی۔ ملا صاحب اس کے استاد تھے۔ فارسی شعر میں اتنا بڑھ گیا کہ خود استاد کو کہنا پڑا کہ ؎

کوئی نہ ساتھی نہ سہارا ہے۔ اس وقت اے خدا تو اپنی ہی پناہ میں رکھو، خاوند تو ہے نہیں کہ اب وہ سہارا بنے)۔

شاہو فقیر۔ غلام علی فقیر۔ دریا خاں۔ یہ تینوں روحل فقیر کنڈڑی والے کے لڑکے تھے۔ تینوں شاعر اور مقامات سلوک کے شہسوار تھے۔ دریا خاں کا درجہ سندھی شاعری میں اپنے بھائیوں سے بہت بلند ہے۔

ملا صاحبڈنہ صاحب شکارپوری۔ فارسی عربی اور سندھی کا فاضل اور اپنے وقت کا بہت بڑا صاحب طرز شاعر تھا۔ فارسی میں اس کا دیوان ہے۔

سندھی کلام زیادہ تر مدح رسولؐ پر مشتمل ہے۔ "اعثنی یا سید رس یا نبی خیر البشر" انہیں کی مدح ہے جس کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔

جمن چارن ۔ ملا صاحبڈنہ کا معاصر اور نعت گو شاعر تھا۔ ان کی نعت "یا پیر پیراں بادشاہ" کو غیر فانی مقبولیت حاصل ہے۔ آنکھیں ضائع ہوگئی تھیں۔ دل سوزی کے ساتھ نعت گوئی کی برکت سے پھر آنکھیں روشن ہوئیں اولاد نہیں تھی وہ بھی آرزو پوری ہوئی۔ سرفراز صاحب اور جمن کی نعتیں سندھی ادبیات

ان کی تصانیف میں دیوانِ آشکار (فارسی) رازنامہ، رہبر نامہ، قتل نامہ، گدازنامہ، اور تارنامہ، ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے سندھی غزلیات، دوہوں، اور کافیوں کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ایک دوہا اور درج ذیل ہے۔

هِڪُ وسڻ بِيو وَڄڻ ٽِيون لهی پیو سيءُ
جهوري وڌن ۾ جهوپيون ڇِڻُ وڏائين ڇيءُ
رڻن جو رڻ ۾ والي وسيلو ٿسيءُ
حال جنهن جو هيءُ
ميهار ور رک پناه ۾

سسی اپنے محبوب پنہوں کو ڈھونڈنے نکلی ہے۔ اکیلی عورت، نہ راہی نہ راہبر، نہ ساتھی نہ سواری، ایک اکیلی جان گرتی پڑتی جارہی ہے، راستہ میں ایک جگہ کی کیفیت بیان کرکے کہتی ہے۔ ایک تو پانی برس رہا ہے پھر بجلیوں کی کڑکڑاہٹ نے دل دہلا دئے ہیں، اور پھر سردی بھی غضب کی پڑنے لگی ہے، ان سب مصیبتوں کے ساتھ ساتھ پھر ایسے میں جہاں سر چھپائے ہوئے بیٹھی ہوں وہ جھونپڑی بھی جھک گئی ہے اور چھت میں سوراخ ہو گئے ہیں، جن سے پانی کی بوندیں گر رہی ہیں۔ بیابان میں ایک ویرانی اور ہو کا عالم ہے اندر

وڃين ڏيج پرين کي اهو پاڇيءَ جو پيغام
ڪري قدمن تي پيئي سو لک ڏيج سلام
آهي ا وهان ريءَ سپرين مٿ يوئي ماتام
اچڻ جو آجام سگهو ڪر سپرين

(خدا کے لئے تو محبوب کے پاس اڑکر پہنچ، پہلے تو اس کے قدموں میں گر جا۔ پھر سیکڑوں لاکھوں سلام پیش کر، اس کے بعد عرض کر کہ اے محبوب تیرے بغیر ہر طرف ماتم ہے، اگر تھوڑی سی بھی عنایت کر سکے تو جلد آنے کا وعدہ کر)۔

موکي رات رسيون ڏيهه ڏاڏا ٽيون خبرون
ته سانيهه سپر هو ٿيو جون وارا وسيون
برابر بادل ڪيون مٿي لوڏ لسيون
وڙهيون ڪر ڪسيون پڻ آهن تار ترائيون

(ماروئی اپنے وطن کو یاد کرکے کہہ رہی ہے کہ مجھے رات وطن سے اس طرح کی خبریں آئی ہیں کہ تمام سانیھ (وطن) جو کہ میرے باپ دادا کا وطن ہے، تر و تازہ ہو گیا ہے، بادل برسے ہیں اور بجلیاں بھی خوب کڑکی ہیں، اب تو نہریں بھی بہہ رہی ہیں اور ترائیاں بھی پانی سے بھر گئی ہیں)۔

جاتے ہوئے بمبئی میں چھپوایا۔ ان کے دیوان میں "کافی" "بیت" اور "دوہے" کے بجائے سب کی سب فارسی عربی بحروں میں غزلیں ہیں۔ ٹھیٹ سندھی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی کثرت سے موجود ہیں اور اکثر آمد کے بجائے آورد کا احساس ہوتا ہے۔ سندھی شعر کی جو خصوصیات ہیں مثلاً سوز و گداز، سادگی اور آمد وہ اس کے کلام میں قائم نہیں رہ سکیں در اصل اس کی پوری شاعری معاملہ بندی اور الفاظ کی بازی گری کا شاہکار ہے۔

سچل سرمست - ($\frac{1152}{1739}$ - $\frac{1242}{1826}$) شاہ لطیف کی طرح یہ بھی سندھ کا لافانی شاعر ہے۔ لیکن رنگ بالکل جداگانہ ہے ہمہ اوست کے فلسفے کا ان پر اتنا گہرا اثر ہے کہ ان کو اپنے کلام کا ایک حصّہ خود ہی برباد کرنا پڑا تاکہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر گمراہ نہ ہو جائیں۔ نفی اثبات، فنا بقا، حال قال، ہمہ اوست اور وحدت الوجود جیسے اہم مسائل کے اسرار و رموز سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے۔ پورا کلام استادانہ رنگ لئے ہوئے ہے سندھی کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان کے اصلی رنگ سے ہٹ کر یہاں ان کے چند دوہے دیئے جاتے ہیں۔

الله لگ اڏاهه موتي محبوب نڌي

کسی کی سفارش کی۔ اس نے فقیر کی بات نہیں مانی، اس پر یہ
بد دعا ان کی زبان سے نکلی۔

حیدر آباد ۾ ھل ٿیو ــــــ رت وھي ٿي ريل
پور ١١ چي پيل ــــــ ساري سنڌ صديق چوي

(اے سفید فام فرنگی تمام سندھ کو روند ڈال اور حیدرآباد
میں خون کی نہریں بہادے)۔

چنانچہ فقیر نے اپنی دعا کی مقبولیت کو اپنی آنکھوں سے
دیکھ لیا۔ "درد نامہ" بھی ان کی تصنیف ہے اور سندھی دوہوں
پر مشتمل ہے۔

اخوند عزیز اللہ متعلوی۔ $\frac{1160}{1747}$ ـ $\frac{1240ھ}{1824ء}$ جید عالم اور
صاحب فضیلت بزرگ تھے۔ قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ
کیا۔ ان کی یہ کتاب سندھی نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے۔

خلیفہ گل محمد ہالہ کنڈی۔ ($\frac{1226}{1811}$ ـ $\frac{1272ھ}{1856ء}$) یہ شاعر
پرانا ہالہ کے مشہور سانونی ملاؤں کے خاندان سے تھا۔ یہ خانوادہ
اپنے دور میں دینی علوم کا ملجا تھا۔ گل محمد کی بیعت حضرت پیر محمد راشد
رحمۃ اللہ علیہ سے تھی سندھی کا یہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنی
غزلوں کا دیوان مرتب کیا اور اس کو خود ہی ۱۲۷۲ھ میں جج کو

سیدخیر شاہ پردیسی حیدر آبادی۔ کلہوڑوں کے آخری
دور اور ٹالپوروں کے اوائلی عہد کا شاعر اور ثابت علی شاہ کا
معاصر بلکہ مخالف شاعر تھا۔ دونوں کے مابین ہجویہ شاعری کا
معرکہ ہوا ہے "ٹوپی اور پگڑی" کا مکالمہ، جنگ نامہ، اور سندھی
دوہے ان کی تصانیف ہیں۔

صدیق فقیر سومرو۔ پورا ٹالپوری عہد ان کے سامنے گذرا۔
انگریزی عمل داری کی ابتدا میں انتقال کیا۔ دھورو نارو زتھر پارکر
میں قیام تھا۔ ان کے دوہوں کا مجموعہ بھی شاہ لطیف کی طرح
"رسالہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہی ترتیب سُروں کی وہی تقسیم
اور زبان اور اندازِ بیان کا رنگ بھی بالکل وہی ہے۔

جیڏ و ئي تـو نام	ٻاجهہ ايڏي ٻائي گهران
تون چپر تون چيان	تون منهہ، تون ٿوٽيون
تو کي معلوم سڀ کا	چوان ڪيجا ٿرو آ ن

(میں اتنی ہی بڑی عنایتوں کا خواہشمند ہوں جتنے کہ تم خود بڑے
ہو۔ سب کچھ تم ہی ہو۔ میں کیا بتاؤں۔ تم جانتے ہو کہ میں کیا
مانگتا ہوں)۔

ان کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے ٹالپور حکمران سے

رنگی ہوئی ہیں لیکن ادبی اعتبار سے انہیں یہ فخر حاصل ہے کہ کئی چیزوں
کی ابتدا کر کے سندھی شاعری کے لئے نئی نئی راہیں کھول دیں۔ فارسی
غزل کے مقابلہ میں انہوں نے سندھی غزلیں کہیں اور ان کا پورا
کلام عربی فارسی بحروں میں ہے۔ ہجو یہ اشعار بھی سب سے پہلے انہوں
نے لکھے "چٹنگ" اور "لکڑ د" میں ہم عصر شعرا کی ہجویں کہی ہیں۔ رزمیہ
نظم کو بطور صنف کے سب سے پہلے انہوں نے اختیار کیا۔ اگرچہ
ان سے پہلے کے شعرا نے بھی رزمیہ انداز میں کچھ اشعار کہے ہیں۔
مثلاً "دودو چنیسر" شاہ صاحب کا "تمر کیڈارو" اور مخدوم عبداللہ کا
"شہادت نامہ" اور "روضۃ الشہدا" وغیرہ۔ لیکن ان شعرا نے رزم
کو غیر شعوری طور پر اختیار کیا ہے اور سید ثابت علی شاہ نے بطور فن
کے اس کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ انہوں نے سندھی زبان میں
کثرت سے فارسی الفاظ کی آمیزش کی اور فارسی محاورے تشبیہیں
اور خیالات اس فراوانی کے ساتھ سندھی میں لے آئے کہ زبان کا
ڈھانچہ ہی بدل گیا۔

اُن کی زبان کا نمونہ یہ ہے :-

شام غربت مثل ھو صبح یتیماں حسین ÷ صبح محشر مثل تھیو شام غریباں حسین

واحسرتا بہ صبح یتیمان کربلا ÷ واغربتا بہ شام غریبان کربلا

تھے۔ لیکن داستان کی کڑیاں اور تسلسل انہوں نے قائم رکھا۔ ان کا لکھا ہوا "مومل رانے" کا قصّہ سندھی زبان کا شاہکار ہے۔ آنکھوں سے معذور تھے اور ساتھ ہی اَن پڑھ بھی۔ لیکن قدرت نے زبردست شاعرانہ صلاحیت ودیعت کی تھی۔ ٹالپوروں کے ابتدائی عہد میں انتقال کیا۔

خلیفہ حاجی عبداللہ۔ ان کے والد خلیفہ محمود کرڑیہ والا اپنے وقت کے کامل بزرگ تھے۔ حضرت پیر محمد راشد علیہ الرحمتہ سے بیعت تھے اور ان کے ملفوظات خلیفہ صاحب نے قلم بند کئے ہیں۔ حاجی عبداللہ خود سندھی کے بے مثل شاعر تھے۔ "لیلیٰ مجنوں" کی داستان کو سندھی نظم میں (۱۲۰۸ھ) مسلسل بیان کیا ہے۔

مولوی ولی محمد۔ عربی کی کتاب "حکایات الصالحین" کا انہوں نے سندھی دوہوں میں (۱۲۲۰ھ) ترجمہ کیا اور ایک زمانہ تک یہ کتاب سندھی نصاب میں داخل رہی۔

سید ثابت علی شاہ ($\frac{\text{۱۱۵۳ھ}}{\text{۱۷۴۰ء}}$ - $\frac{\text{۱۲۲۵ھ}}{\text{۱۸۱۰ء}}$) کلہوڑوں کے آخری دور اور ٹالپوروں کے ابتدائی عہد کا یہ شاعر سندھی میں مرثیہ گوئی کا بانی اور موجد ہے۔ زیادہ تر تصنیفات مذہبی رنگ میں

کامل قربان کریان ‏ ‏ ‏ ‏ سودا سپ مٿائُ

تنھنجو مٿ مراد ڇوي ‏ ‏ ‏ ‏ آءُ لھان ڪاند ڪنائُ

عاقل انگڻ آءُ ‏ ‏ ‏ ‏ ته سرتن سڪائون ڏيان

(تم راجہ ہو بلکہ راجوں کے بھی راجہ ہو۔ تم راج دلارے ہو اور پرجا کے پیارے ہو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تم پر قربان کروں۔ تم ایک مرتبہ میرے صحن میں آجاؤ۔ تاکہ میں اس قابل ہوجاؤں کہ سہیلیوں میں شیرینی بانٹ سکوں)۔

ڪاف ڪُھجاڙي ڪاڻ ‏ ‏ ‏ ‏ تي ڪوڪون ڪريان ڪاند لئي

جي پرين لئي پنڌ ڪرين ‏ ‏ ‏ ‏ سي تان توئي ساڻ

موٽي وڃ مراد ڇوي ‏ ‏ ‏ ‏ اُڏهي منٿ اجاڻ

پيهي نهار ڄ پاڻ ‏ ‏ ‏ ‏ اَتي دل ۾ ڏيرو دوست جو

(پہاڑوں سے تم کہاں سر ٹکراتی پھر رہی ہو۔ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہے۔ واپس جاؤ اور اپنے ہی میں اس کو ڈھونڈو وہیں دوست کا ڈیرا ہے)۔

حفیظ۔ سندھی میں داستان کو مسلسل نظم میں سب سے پہلے انہوں نے قلمبند کیا۔ ویسے تو شاہ عبداللطیف اور شاہ عنایت بھی اپنے دوہوں میں قصّوں کے بعض اجزا کو لا چکے

غزل کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ سید ثابت علی شاہ اور سچل سرمست نے خاص طور پر غزل میں طبع آزمائی کی اور اگرچہ تکنیک کے اعتبار سے اس دور کی غزل میں پختگی نہیں آئی۔ لیکن انہی بنیادوں پہ اگلے دور کے شعرا نے سندھی غزل کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ اس دور کے صاحب طرز شعرا اور ادیب یہ ہیں۔

مراد فقیر۔ یہ شاعر روحل فقیر کا عزیز اور اسی کے رنگ سے متاثر تھا۔ سندھی کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہا ہے اس کے سندھی کے دوہے بہت بلند پایہ ہیں۔ ہمہ اوست کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین کو بھی برتا ہے اور خوب نباہا ہے۔

جي پارين تہ پار — اندر باھ برہَ جي
مٿي مَيڇَ مراد چوي — ڪيئي پتنگن پچار
تہ جيئري جانبُ نہ ملندءِ — توڙي حيلا ڪرين هزار
دوستاڻي در بارِ — نامُنا ڪَنِ مشاهدا

(آگ کے سامنے پروانوں کے درمیان بات ہو رہی تھی کہ زندہ رہ کر محبوب کبھی نہیں مل سکتا خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے۔ دوست کے دربار میں تو جان دے کر ہی رسائی حاصل کی جاتی ہے)۔

تون راڻون تون راڇيو — تون راٿن جو راءُ

اور ان کی دیکھا دیکھی یہاں بھی اس صنف میں طبع آزمائی شروع ہوئی۔ چنانچہ سندھی زبان کا سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر سید ثابت علی شاہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مرثیہ گوئی کی وجہ سے شعر کی زبان میں فارسی الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے اور سید ثابت علی شاہ پہلا شاعر ہے جس نے فارسی آمیز زبان میں شعر لکھا۔ مرثیہ کے مضامین اور خیالات چونکہ ایران سے مستعار لئے گئے تھے۔ لہٰذا بہت سی غیر وطنی چیزیں بھی داخل ہو گئیں۔

سندھی زبان میں نثر کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ چنانچہ اخوند عزیز اللہ المتوفی ۱۲۴۰ھ نے ایک کتاب لکھ کر اس سلسلہ میں پہل کی۔

اس دور میں وائی کا نام کافی پڑ گیا اور یہ دو مصرعوں کو بڑھا کر مثلث اور مربع مصرعوں میں لکھی جانے لگی۔ ہر قسم کے خیالات جو پہلے دوہوں کے محدود دائرے میں سما نہیں سکتے تھے وہ کافی میں آسانی کے ساتھ لائے گئے۔ اس دور کے ہر شاعر نے دل کھول کر اس صنف میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے۔ اس دور میں یہ صنف کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ تمام شعرا نے اس کو اپنا لیا اور دوہا فقط عوامی شعرا تک محدود ہو کر رہ گیا۔

اچھا موقع مل گیا۔ نظم کے علاوہ نثر پر بھی توجّہ کی گئی اور فارسی کے اثرات زبان اور ادب دونوں پر پڑے۔ ادبی اعتبار سے ٹالپوری دور کی چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں۔

مدح رسولؐ اور مناجات کو اس دور میں کافی ترقی ہوئی۔ پچھلے دور میں سرفراز خان نے اس کی ابتدا کی تھی لیکن اس دور کے شعرا نے اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ صاحبڈنہ فقیر کی " اغثنی یا سیّدا " جمن چارن کی " یا پیر پیران بادشاہ " اس دور کی خاص چیزیں ہیں۔ پیر اشرف اور فتح فقیر کی مناجاتیں بھی لازوال حیثیت رکھتی ہیں۔

مسلسل قصّوں کو مثنوی کے انداز میں نظم کرنا بھی اس دور کی خصوصیات میں سے ہے۔ پچھلے دور میں شعرا نے ان داستانوں کے بعض اجزا کو تلمیح کے طور پر یا پیرایۂ بیان کے لئے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس دور میں پوری داستانوں کو قلم بند کیا گیا۔ چنانچہ حفیظ نے " مومل رانہ " کی داستان لکھ کر اس کی ابتدا کی اور پھر حاجی عبداللہ نے " لیلیٰ مجنوں " (۱۲۰۸ھ) لکھی اس کے بعد بہت سے شعرا نے داستان بندی کو اختیار کر لیا۔

مرثیہ بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ ٹالپور شیعہ حکمراں تھے۔ ایران سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہاں سے مرثیہ گو شعرا آتے رہے

پانچواں باب

ٹالپوری عہد کا سندھی ادب

۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء — ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء

کلہوڑوں کے آخری فرماں روا میاں عبدالنبی اور ٹالپور قبیلہ کے سردار میر فتح علی خاں کے درمیان ہالانی کے میدان پر ۱۱۹۷ھ میں غضب کا رن پڑا۔ شکست حکمراں کے حصہ میں آئی اور سندھ کی مملکت ٹالپور خاندان کے حوالہ ہوئی۔ انگریزوں کے قبضہ (۱۸۴۳ء) تک سندھ پر اسی خاندان کی حکومت رہی۔

ٹالپور خاندان بھی کلہوڑوں کی طرح مقامی نسل کے حکمرانوں پر مشتمل تھا۔ اس لئے اس عہد میں بھی سندھی ادب اور زبان کو کافی ترقی ہوئی اور مسلسل ڈیڑھ صدی تک سندھی ادب کو پھلنے پھولنے کا

پیرو مرشد کی خدمت گذاری میں مصروف ہو گئے۔ ایک عرصہ کے بعد جب روحانی مدارج کا سفر طے کر لیا تو کنڈڑی کے قصبہ (خیرپور) میں جا کر مستقل سکونت اختیار کی اور یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ شاہ عنایت صوفی وہی بزرگ ہیں جن کو لادینی کے الزام میں کلہوڑوں نے قتل کرا دیا تھا۔ اس بزرگ کے چار بیٹے ہوئے۔ شاہو فقیر، غلام علی فقیر، خدابخش فقیر، اور روحل دریا خاں، یہ سب کے سب شاعر تھے، اور اپنے باپ کے رنگ کی پیروی کی۔

صاحبڈنہ فقیر۔ (۱۱۰۱ – ۱۱۹۹ھ) یہ بزرگ درازا قصبہ (خیرپور) کا باشندہ تھا۔ سچل سرمست اس کا پوتہ ہے۔ عام رنگ یہ ہے۔

ملان جي محبّت جي — وٽي هڪ پٽين
چڙهي مڪتب معرڪا — هوندسوريُ سرُ ڏيئين
ڪيئن تون هت جيئن — ري سڪ صاحبڏنه چوي

(اے میرے دوست مُلّا! اگر تم کو محبت کا ایک چھوٹا سا پیمانہ بھی نصیب ہو جاتا تو تم کبھی بھی مدرسہ کے معرکوں میں مبتلا نہ ہوتے۔ فوراً جا کر کہیں نہ کہیں سولی پر سر دیدیتے۔ لیکن بھائی میں تو حیران ہوں کہ تم محبت کے بغیر یہاں جی کیسے رہے ہو)۔

اب تو وہ اتنے دور جا چکے ہیں کہ شکوہ شکایت بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی

جي کھان نه کوک نه نکري   صبر آءُ نه سهان

اکيون لايون پرکي   ويسٽي سور لهان

کنهن کي کين چوان   ته کنهن پرا کنديون آهيان

(کہنا چاہتی ہوں تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی اور صبر بھی نہیں کیا جاتا۔ اب تو آنکھیں دوست کی طرف لگی ہوئی ہیں اور بیٹھی ہوئی درد اور دکھ برداشت کر رہی ہوں اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ یہ سب کچھ کس کے لئے ہو رہا ہے)۔

سج لهي سانجهي ٿي   پکي ويا وٽين

اڏ رهينءَ ايونه ٿي   اُسه پرمٽين

تو ري ڏينهن گهٽين   ميڙ وتيندءِ سجٽين

(سورج ڈوب گیا دن ختم ہو چکا اور پرند اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف چل دئے۔ اے روح اب تو بھی بھونرا بن کر اڑ جا کبھی نہ کبھی تو تیرا بھی وصل محبوب کے ساتھ ہو کر رہے گا۔

روحل فقیر۔ (۱۱۰۸ - ۱۱۹۸ھ) روحل فقیر نے میاں دین محمد کلہوڑہ ($\frac{۱۱۰۸}{۱۶۹۶}$ - $\frac{۱۱۱۲ھ}{۱۷۰۰ء}$) کی ملازمت سے زندگی کی ابتدا کی جب شاہ عنایت میران پوری سے ملاقات ہوئی تو ملازمت چھوڑ چھاڑ کر اپنے

شاعری میں فارسی عروض اور بحروں کو لانے کی سب سے پہلے انہوں کوشش کی ہے اور ان کے بعد اگلے دور میں اخوند گل محمد نے عربی اور فارسی اوزان کو مکمل طور پر سندھ میں رائج کیا۔ غالباً کریمہ کا سندھی ترجمہ بھی اصل فارسی بحر میں انہوں نے کیا ہے۔

سرفرازخاں کلہوڑو۔ (۱۱۸۹ھ) سرفرازخاں کلہوڑو۔ والئ سندھ، سندھی اور فارسی کا بے مثل شاعر تھا۔ مدح رسول (مناجات) سندھی شاعری میں سب سے پہلے انہوں نے لکھی بعد میں جمن چارن اور میاں صاحب ڈنہ شکارپوری نے اس صنف کو مقبول عام بنایا۔ سرفرازخاں کی مناجات کو اتنا قبول عام حاصل ہوا کہ ابھی تک سندھی اس کو نہیں بھولے۔ اس وقت بھی عورتیں اس کو پڑھتی رہتی ہیں۔

پیر محمد بقاؒ (المتوفی ۱۱۹۸ھ) پیر محمد لراشد۔ پیر پگارڈہ کے سجادہ کا مورث اوّل انہیں کا فرزند تھا۔ انہوں نے دین کے ساتھ ساتھ سندھی ادبیات کی سرپرستی بھی فرمائی۔ شعر کا نمونہ یہ ہے۔

ته نت نيا پا آئيا   اوڏا اجي هئام

وهيا وس وِيام   سنگهار اسانگ پيئي

ذيان ذور پاڪنهن کي   مار و ثر تيبام

(جب محبوب قریب تھے تو سلام و پیام بھی آیا کرتے تھے لیکن

(۶) مولوی محمد حسین، مصنف "سیر بستان" ترجمہ قصص الانبیا (تصنیف ۱۱۷۷ھ)۔

(۷) مخدوم محمد ابراہیم بھٹی ہالہ کنڈی، مصنف "سندھی محمد ابراہیمؒ (تصنیف ۱۱۹۶ھ)

(۸) مولوی عبدالسلام، مصنف "شمائل نبویؐ" (تصنیف ۱۱۹۷ھ)

یہ تمام تر کتابیں مولوی ابوالحسن کی ڈالی ہوئی طرح پر سندھی نظم میں لکھی گئی ہیں۔ نظم مسلسل ہے۔ قافیہ ردیف کی کوئی پابندی نہیں کی گئی۔ آخری لفظ میں الف لگا کر اس کو قافیہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً مومنا دریا۔ امرا۔ ادبا۔ حکمنا۔ حکما وغیرہ وغیرہ۔

اس دور کے باقی شعرا یہ ہیں:۔

مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی۔ (المتوفی ۱۱۹۲ھ) یہ بزرگ مخدوم سعداللہ کے بیٹے اور خواجہ محمد زماں لنواری والہ کے خاص مرید اور خلیفہ تھے۔ "فتح الفضل"، "ابیات سندھی" اور "مکتوبات" ان کی تصانیف ہیں۔ سندھی شعر لطیف، صاف، رواں اور سادہ ہے۔

مخدوم عبدالرؤف بھٹی ہالہ کنڈی۔ (المتوفی ۱۱۹۹ھ) یہ بزرگ سندھی شاعری میں مولود النبی کی صنف کے موجد ہیں۔ عروض کی بحروں میں ان کے چند مولود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھی

ہیں۔ تفسیر پارۂ تبارک، تفسیر پارۂ عم، فرائض الاسلام، راحتہ المومنین، زاد الفقیر، سندھی تصنیفیں ہیں۔ فرائض الاسلام، ابوالحسن کی کتاب سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ ابوالحسن نے تو فقط ۱۳۰ مسائل کو لیا ہے۔ لیکن انہوں نے ۱۲۶۲ مسائل کا احاطہ کر لیا ہے۔

انہی بزرگوں کی تصانیف کی وجہ سے سندھی زبان میں کتابیں لکھنے کا ایک عام رجحان پیدا ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک انبار لگ گیا۔ اس سلسلہ کے چند مشہور مصنّفین یہ ہیں۔

(۱) مخدوم محمد شریف رانیپوری۔ مصنّف ملکی سندھی (تصنیف ۱۱۶۰ھ)۔

(۲) مولوی علی اکبر مصنّف "الاموال وسجل الاموال" (تصنیف ۱۱۶۲ھ)

(۳) مولانا احمد۔ مترجم۔ "روضتہ الشہدا" (ترجمہ ۱۱۷۲ھ)

(۴) مخدوم عبدالخالق ٹھٹھوی مصنّف "مطلوب المومنین" (تصنیف ۱۱۷۵ھ)

(۵) مخدوم عبداللہ ٹھٹھوی مصنّف "کنزالعبرت" (تصنیف ۱۱۷۵ھ) ومصنّف "قصص الانبیا"۔ "خزانتہ الابرار"۔ "خزانتہ الاعظم" "خزانتہ الروایات"۔ اور "تنبیہہ الغافلین"۔

اس کتاب کی مقبولیت دیکھ کر مخدوم ابوالحسن کے بعد دوسرے علما نے بھی اسی سلسلہ کی کتابیں لکھیں۔ مثلاً مخدوم محمد ہاشم، مخدوم ضیاء الدین، مخدوم عبداللہ، میاں غلام محمد، میاں عبداللہ اور میاں عبدالسلام وغیرہ۔ اسی دور کے سندھی مصنفین ہیں۔ اور تقریباً پچاس کے قریب کتابیں درس اور عام مطالعہ کے لئے لکھی گئیں۔

مخدوم ضیاء الدین ٹھٹھوی۔ (۱۰۹۱-۱۱۷۱ھ) سندھ کے بے مثل اور یگانۂ روزگار عالم مخدوم محمد ہاشم انہی بزرگ کے شاگرد رشید تھے۔ خود انہوں نے ٹھٹھہ کے جید عالم دین۔ مخدوم عنایت اللہ سے تحصیل علم کیا۔ تکمیل کے بعد انہوں نے ٹھٹھہ میں اپنا مدرسہ قائم کیا اور درسی ضروریات کے لئے مخدوم ابوالحسن کی تقلید میں ایک کتاب انہی مضامین پر لکھی جو "مخدوم ضیاء الدین کی سندھی" کے نام سے مشہور ہوئی۔

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی۔ (۱۱۰۴-۱۱۷۴ھ) اس دور کے سب سے زیادہ مشہور عالم دین اور اپنے فن میں امام وقت تھے۔ ان کی شخصیت کا اثر نہ صرف عوام پر تھا بلکہ حکومت وقت بھی ان سے متاثر تھی۔ فارسی، عربی اور سندھی میں تقریباً تین سو کے قریب تصانیف چھوڑیں جن میں کئی ایک ٹھوس اور بے مثل علمی کتابیں

دنيا تن کي دام پيچن موسم موت جي

(محبوب کی یاد سے جن کو لطف آگیا ہے اور جو اس میں راحت پاتے ہیں ان کے لئے یہ دنیا ایک دام کی طرح ہو گئی ہے وہ تو موت کے منتظر ہیں اور اسی کی تلاش میں رہتے ہیں)۔

ان کے کل ۴۸ اشعار ملے ہیں جو سب کے سب اسی رنگ کے ہیں۔

میاں ابوالحسن۔ (المتوفی ۱۱۶۳ھ) یہ ٹھٹھہ کے باکمال ادیب اور بے مثل عالم تھے۔ مذہبی علوم کا درس دیتے تھے۔ انہی ضرورتوں کے ماتحت انہوں نے عقائد اسلام کے سلسلہ میں سندھی نظم میں ایک کتاب "مقدمۃ الصلوٰۃ" کے نام سے لکھی۔ یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ جو سندھی زبان میں لکھی گئی۔ (۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء) کتاب میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ اور دوسرے فقہی مسائل جن کا واسطہ ایک مسلمان کی روز مرہ کی زندگی سے ہے۔ نہایت آسان اور سیدھے سادے طور پر نظم کئے ہیں۔ اس کتاب کو وہ دس برس تک اپنے ہی مدرسہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ کتاب کی زبان بہت قدیم سندھی ہے۔ عربی کے نسخ خط میں لکھی گئی ہے اور سندھی آوازوں کے حروف چونکہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئے تھے اس لئے ان کے بجائے عربی حروف سے ہی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ڏ - ڎ - ٽ - ٺ - ڀ - وغیرہ نہیں ہیں۔

بالیدگی پاؤں)۔

سين هوت حضور سين پچر پرينءَ جي
کُهي کَهبا ڪيترا ملڪ سرپ منصور

(ہر ایک انہیں کا نام لے رہا ہے اور وہ ہر ایک میں موجود ہیں۔ پورے کا پورا ملک منصور ہے۔ آپ کس کس کو قتل کریں گے)۔

دوزخ جو دونهون پلينءَ هن پلپور ۾
پيچي ڪاهيو ڪيچ ڏي سوار وسو نهون

(اس بھنبھور کے شہر میں تو دوزخ کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ کیچ (محبوب کے وطن) کا راستہ معلوم کرکے ابھی سے وہیں چلو)

حقيقت حبيب جي عجب اجهڙي آهه
نڪ مخلوقتا نڪ چئبو سو ڏي
جامع ليل ونهار جو شفق جي سا جاءِ

(کیسی حیرانی کی بات ہے! دوست بھی عجیب طرح کا ہے نہ تو اسے خالق کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کو مخلوق ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مثال تو شفق کی سی ہے کہ نہ تو اس کو دن کہا جا سکتا ہے اور نہ رات بلکہ وہ تو جامع ہے ان دونوں کا)۔

اچي جن آرام پريان جي پيچار ۾

صاحب تصرفات بلیغ، ..... عالمی را بفیض وافی پرساند،
اکثر مردم را عقیدہ، دریں وقت وجود شد دریں
طریقہ بے ہمتا است" (۳۵)۔

اس دور میں شاہ صاحب اور خواجہ صاحب نے اسلامی
تصوّف کو سندھی شعر میں داخل کیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کا تمام تر
کلام اسی ایک فلسفہ کا آئینہ دار ہے۔

سڄڻ ڏٺو جن | تن ڏسڻ غير گناه
جنين لڌي راه | وهڻ تنين ولا تيو

(محبوب کو جنہوں نے دیکھ لیا ان کے لئے پھر غیر کی طرف
نگاہ اٹھانا گناہ ہو گیا۔ اور جن کو راستہ معلوم ہو گیا ان کے لئے
پھر بیٹھ رہنا زہر ہو گیا)۔

آءُ اُن ڏينهان | سڪان سپرين کي
جنءَ اوڏا اتيا ان کي | آدم ۽ هو!
محبت مٿو نوماءِ | مثال موتي ما گهيتي تيان

(اسی دن سے میں تو محبوب کے دیدار سے محروم ہو گیا جس
دن آدم اور حوا نے ایک دانہ کھا لیا۔ خدا کرے کہ اب کوئی دن
ایسا ہو جائے کہ میں پھر اپنی منزل پر پہنچ کر دیدار سے روح کی

مذہبی، ذہنی اور ادبی حالات پر بھی بسیط روشنی ڈالی گئی ہے۔
اس کتاب کے آخر میں شاہ صاحب کی اہم تصنیف "شاہ جو رسالو"
کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

میاں عیسیٰ ہالائی (۱۱۶۳ھ)۔ یہ شاعر شاہ صاحب کا معاصر
تھا۔ ۱۱۶۳ھ تک اس کے زندہ رہنے کے شواہد موجود ہیں۔ ان کے
حالات ابھی تحقیق طلب ہیں۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کو ان کا دیوان ملا
ہے۔ جس پر وہ تحقیق کر رہے ہیں، اس دور کا قادرالکلام شاعر ہے۔

خواجہ محمد زماں لنواری والہ۔ (۱۱۲۵ - ۱۱۸۸ھ) خواجہ محمد زماں
اس دور کے باکمال شاعر اور کامل بزرگ تھے۔ وفات کے وقت
یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔

اوڏڻ او ڏيھ آئُ | توکي لاکي ڪوٺيو
لھي تو مٿاءُ | سند و منٺيَ مامرو

(چلو تم کو دوست کا بلاوا آگیا۔ اچھا ہوا خاکبازی سے
نجات ملی) تحفۃ الکرام نے ان کے لئے لکھا ہے:-

"میاں محمد زمان، مشائخ حالی، از معتقدان میاں
ابوالقاسم نقشبندی، و میاں محمد نقشبندی تتوی،
بفراوان رشد، سلسلۂ نقشبندیہ مرجع ارباب ارادت؛

میںھون محبت سندیون ھئنتي منجھہ ھزار
پَکا ءِ پَنھوار ڏيِ مون ڏیھن تیا

ماروئی کو عمر کے پاس قید میں رہتے ہوئے مدتیں ہوگئی ہیں۔ لیکن اپنے عزیز، اپنی سہیلیاں، ہمسائے کی لڑکیاں اور اپنا وطن وہ ابھی تک نہیں بھولی ہر وقت اس کو انہیں کی لگن رہتی ہے۔ عمر تنگ آکر ان کو برا بھلا کہتا ہے۔ ماروئی خاموش ہو جاتی ہے اور دل میں کہنے لگتی ہے کہ۔ (اے عمر! تم اندازہ نہیں کر سکتے میں کیسے بھول جاؤں۔ میرے جسم کے ہر ایک جوڑ میں ان کی محبت اور ان کے عشق کی کیلیں لگی ہوئی ہیں اور وہ بھی کسی لوہار کے ہاتھ کی نہیں کہ کبھی نکل بھی سکتی ہوں۔ بلکہ یہ تو اس طرح کسی نے لگا دی ہیں کہ کبھی ڈھیلی تک بھی نہیں ہو سکتیں۔ تم خود ہی انصاف کرو۔ اے عمر! ہم وطنوں کو دیکھے ہوئے کتنے موسم مجھ پر بیت گئے ہیں) —

ٹی۔ ایچ سورلے نے شاہ لطیف کی زندگی اور شاعری پر ایک نہایت مبسوط اور فاضلانہ کتاب لکھی ہے جس میں شاہ صاحب کے سوانح حیات بڑی احتیاط اور تحقیق کے ساتھ قلم بند کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان اثرات کو واضح کرنے کے لئے جو اُن کے دل و دماغ پر طاری ہوئے۔ ان کے عہد کے سیاسی، معاشی،

پهرين وڃان لوءِ پوءِ مر پهنجمر ڏينهڙا

(کبھی بھی خدا کرے ایسا نہ ہو کہ میں یہاں قید و بند میں مرجاؤں

رات دن بس یہی ایک آرزو ہے کہ ایک دفعہ وطن پہنچ لوں پھر

اگر زندگی کے دن ختم ہو جائیں، تو ہو جائیں)۔

واجهايو وطن ڏي سارِيوسا ڏيان

هيءَ مٿ هسا تي پهڻو منهنجو نيچ ميان

تہ مقاميا ٿي مارئي وڃين تر ٿيان

هوندا ٿيا ٿي جيان جي وڃين مٿ هملير ڏي

ماروئی عمر کے قلعہ میں بند ہے۔ وطن سے دور۔ وقت بیت

رہا ہے جیسے جیسے دن گذر رہے ہیں اسے یہ خیال ستا رہا ہے کہ

کہیں میں یہاں نہ مرجاؤں۔ کہتی ہے۔

(وطن کی طرف جب نگاہیں اٹھتی ہیں تو روح بھی اسی طرف

پرواز کرنے لگتی ہے۔ اگر ایسے میں میں مرجاؤں تو اے عمرا میری

نعش کو وطن پہنچا دینا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے وطن کے قبرستان

کی مٹی میرے جسم سے مس ہوئی تو میں پھر جی اٹھوں گی)۔

آءُ ڪينءَ چئي پان سومر اپنهوار ن پنچان

جت جنهين جي جان هر لڳي رئي لطسار

سے آکر اس کی باتیں کی ہیں ان پر یہ لڑکی محبت کی ماری فدا ہو رہی ہے۔ خوشی سے آنکھوں میں پانی کے قطرے نمودار ہیں۔ ہنستی ہوئی خوش خوش ماں کے پاس دوڑتی ہوئی آئی ہے۔

مون سيي ڏٺا ماءِ　　　جنهين ڏٺو پرين کي
ڪري نه سگهان ڪاءِ　　　انهن سندي ڳالهڙي

(اری او ماں! او ماں! خدا کی قسم میں نے ان کو دیکھ لیا۔ سچ سچ کہہ رہی ہوں میں نے ان کو دیکھ لیا جنہوں نے میرے محبوب کو دیکھا ہے۔ اری او ماں! میں جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے ابھی ابھی انہیں دیکھا ہے۔ اے ماں میں کیا بتاؤں ان کی کون کون سی باتیں تمہیں بتاؤں۔ او میری ماں۔ میں نے سچ مچ ان کو دیکھ لیا ہے)۔

ڪي سمھ، ڪي جاڳ　　　ننڊ نه ڪجي ايتري
اي مانجھاندي ماڳ　　　جو تو سائيھ پاتئيو

کبھی سو اور کبھی جاگ۔ مسلسل نیند اچھی نہیں ہوتی۔ جس کو تو نے مستقل وطن سمجھ لیا ہے نہ تیرا ٹھکانا نہیں بلکہ دوپہر کو ذرا ستانے کا مقام ہے)۔

الله ائين نه هوءِ　　　جڏهين آءُ مران ٻنڌ ۾
جسو زنجيرن ۾　　　مرا تو ڏينهن مروءِ

راہ چلنے والے مسافر پہ تم نے ظلم و ستم کے پہاڑ گرا دیے)۔

اَڄُ پٽ اکنڊين — سجڻ سنهنجا سارِيا
ڳلين تان ڳوڙهن جون — بوندون بس نه ڪن
سندي سڪ پرين — لوڪ ڏني تان نه لهي

(آج آنکھوں کو پھر محبوب یاد آگیا۔ گالوں پہ سے آنسوؤں کی بوندیں قطار اندر قطار لڑھکنے لگیں۔ مجھے جو محبّت اور لگن ہے وہ کہیں دوسرے لوگوں کو دیکھ کر تسکین پا سکتی ہے)۔

ڪِتِن ڪَرَ موڙيا — ننيڙ وايا نيڙي
راڻو رات نه آئيو — ويل ٽري ويئي
ڪُهُ سا ڪاڙي راتڙي — جا پرين رئي پيئي
مون کي ڏنءُ ڏيئي — ڍولي وڃ قراريو

(ثریا بھی کروٹیں بدلنے لگی۔ صبح کے ستاروں نے بھی اُبھر کر آنکھ مچولی کھیلنی شروع کر دی۔ پوری رات بیت چکی۔ محبوب نہیں آیا۔ برباد ہو ایسی رات۔ اور تف ہو اس پہ جو اس طرح اکیلے میں گذر جائے۔ کتنی اندوہناک یہ بات ہے کہ مجھے امید دلا کر محبوب ڈھٹ (وطن) ہیں جا کر آرام سے بیٹھ گیا)۔

محبوب کو بعض لوگ دیکھ کر آئے ہیں۔ انہوں نے سسّی

راستہ میں رہ گئی۔ (مرگئی)۔

کنڊا مون پيرن ۾ ... توڙي لک لڳن
اگر آڱوٺي نہ مڙي ... ڇپيون پير ڇڳن
تہ بہ ويندي ڏاهن پرين ... جتي ذات نہ پاڻيان

لاکھوں کانٹے پاؤں میں چبھ جائیں۔ آبلوں کی وجہ سے انگلیاں انگلیوں سے جدا ہو جائیں پھر بھی محبوب کی طرف جانے والے راستہ پر گرتے پڑتے جیسے بھی ہوا اور جس طرح بھی ہو چلتی ہی رہوں گی اور کبھی پاؤں میں جوتے نہ پہنوں گی (جوتیاں پہننے سے مراد بیٹھ رہنے کے ہیں. جس طرح اردو میں چوڑیاں پہن لینے کا محاورہ ہے)۔

ڏونگر ڏور اپو ... پهريون چوندس پرين کي
تہ پهڻ پير پٽون کيا ... تريون چنم تو
رحم نہ پيئي رڃ ۾ ... قدر منهنجو کو
کڏهين وا کاوو ... مون سين جبل جانءِ وڃيون

(اے پہاڑ مجھے محبوب تک پہنچنے دے۔ سب سے پہلے تیری ہی شکایت کروں گی۔ کہوں گی کہ پتھروں نے پاؤں زخمی کر دئے اور تلوے تم نے چھیل دئے۔ تم کو ذرّہ بھر مجھ پر رحم نہیں آیا۔ محبوب کی طلب میں جانے والوں کی تم نے کچھ بھی قدر نہ کی۔ میں چیخ مار کر کہوں گی کہ

قریب کر دیا)۔

هَلُ هيئين سين عوت ڏئي، پيرن پنڌ وسار

قاصد اچي ڪار، ڪين رسائي ڪيچ کي

(دل کے ذریعہ راستہ طے کر۔ پاؤں سے چل کر جانا چھوڑ دے قاصدوں کی طرح پاؤں سے چل کر جانا کبھی تجھے کیچ (محبوب کے وطن) نہیں پہنچا سکتا)۔

آءُ نہ گڏي پرينءَ کي | تون تولهين سِجَ
آءُ جي ڏيئين سنيها | سي نيئي پڌيان ڏج
وڃين ڪيچ چٽج | نہ ويچاري وات مُئي

سسی کا محبوب پنوں بھنبھور کو چھوڑ کر اپنے وطن (کیچ) چلا گیا ہے۔ سسی اس کو ڈھونڈھنے کے لئے بھنبھور سے نکلی ہے۔ گرتی پڑتی اندوہ اور تکلیف سے زار و نزار اس طرف جا رہی ہے اتنے میں دن چھپ گیا اور سورج ڈوبنے لگا۔ کالی رات سر پہ کھڑی ہے۔ راستہ خطرناک، دشوار گذار اور دیکھا ہوا نہیں ہے۔ اس وقت کہتی ہے کہ:۔

(اے آفتاب تم تو غروب ہو رہے ہو ابھی تو میں اپنے محبوب کے پاس پہنچی بھی نہیں۔ اب اتنا کرنا کہ جو کچھ سندیسہ میں کہوں وہ جا کر ان تک پہنچا دینا اور کیچ والوں کو کہنا کہ غریب تمہاری ہی طرف تو آ رہی تھی لیکن

محبوب پر پڑنی چاہئے اور پھر ساتھ ہی اس سے یہ بھی کہہ دے کہ تیرے بغیر وقت بہت سخت کٹ رہا ہے۔ آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی ہیں اور تیری ہی راہ دیکھ رہی ہیں۔

اَڄُ پُڻ وا ٻون ڪنِ ، وِڻجارا وَڃڻُ جُون

هلڻ هار اسپرين ، رُ ٺان تا نه رهنِ

آءُ جهليندي ڪيتر و، آيل سامو نڊ ن

پڳهه چوڙي جن ، و ڏا ٻيڙا پار م

(بنجارے آج سفر پہ جانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جو جانے والے ہیں۔ وہ اگر ہیں زار و قطار روؤں بھی تو کہاں رُک سکتے ہیں جو سمندر کے لوگ ہیں ان کو روکا بھی کتنا جا سکتا ہے اور پھر انہوں تو اپنے جہازوں کے لنگر تک اٹھا دئے ہیں)

اَڄُ پڻ اُتر پار ڏي ، ڪارا ڪڪر ڪيس

وِڄون و سڻ آئيون ڪري لعل لبيس

پرين جي پرديس مون سان ميهن ميڙيا

(آج پچھم سے بادل کالے کالے لبادے اوڑھ کر آ گئے۔ بجلیاں بھی سرخ حریری لباس پہن کر چڑھ آئیں۔ کیا کہنا خدا کے اس احسان کا۔ میرا محبوب دور تھا۔ بارش نے برس کر اس کو میرے

بلکہ الہامی ہے۔ اسی لئے ایک مترجم کے لئے انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ شاہ کے اشعار کا ترجمہ کرتے ہوئے صحیح مفہوم کو ادا کر سکے اور الفاظ، زبان، اور تراکیب کی دلکشی، شیرینی اور نزاکت سے ترجمے میں انصاف کر سکے۔ کہیں کہیں شاہ ایک لفظ ایسا رکھ دیتا ہے کہ مترجم پورا جملہ لکھدے تو بھی اس لفظ کی ہمہ گیری کو نبا ہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ڏاسينديءِ نگاھ، پھرين ڪجِ پرينءَ ڏي

احوال عاجزن جا، آکج لگ الله

روزنهاريان راھ، اکيون اوهان جي آسري

میں جن جذبات کا شاہ نے اظہار کیا ہے۔ ترجمہ میں اس کی نزاکت کو کبھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک زبان میں انداز بیان کے جدا جدا طریقے اور الفاظ ہوتے ہیں۔ سندھی زبان کے جن الفاظ کو شاہ نے انتخاب کیا ہے وہ اتنے نازک اور پُر معنی ہیں کہ انتہائی احتیاط کے باوجود ان کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ادا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بہر حال اوپر دیئے ہوئے شعر کا مفہوم سیدھے سادے الفاظ میں یہ ہے:۔

اے چاند۔ جب تو اُبھرے تو تیری سب سے پہلی نگاہ میرے

جو ان کے جانے کے بعد مجھ پر بیتی ہے)۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ (۱۱۰۲ - ۱۱۶۵ھ) اس دور کی سب سے زیادہ ممتاز ادبی شخصیت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ہے جن کا کارنامہ نہ صرف اس دور، بلکہ سندھی ادبیات کی پوری تاریخ پر بھاری ہے ان کا پورا نام شاہ عبداللطیف بن سیّد حبیب بن سیّد عبدالقدوس بن سیّد جمال بن سیّد شاہ کریم ہے۔ ان کی کوششوں نے سندھی ادب اور زبان کو بیش بہا خزانوں سے مالا مال کرنے کے علاوہ سندھ کی شاعری اور اس کی زبان کو بھی حیاتِ جاویدانہ رشہرتِ لازوال بخش دی۔ شاہ کی شاعری آج بھی اپنی تازگی اور اپنی منفرد طرز کی بنا پر اسی طرح مقبولِ عوام ہے جس طرح دو سو برس پہلے اس نے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرمایا اور پر امید بنایا تھا۔ دراصل اس سرزمین کے ہر باشندے کے دل و دماغ پر شاہ چھایا ہوا ہے۔ ان کے رگ و ریشے میں اس کا پیغام سرایت کئے ہوئے ہے۔ دہقانی اور شہری یکساں طور پر اس سے متاثر ہیں۔ کوئی اور سندھی شاعر اس کی شاعرانہ ہمہ گیری کو نہیں پہنچا۔ نئے نئے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے وہ اس طرح لا کر چسپاں کر دیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان کی شاعری اکتسابی نہیں

اُلِي جَرَ هارِيان، پاڻِي لَئيِ تِنِ
خِضرِ پيرُ خداءِ جو، مانَ مُوٽائي تِنِ
جِنِ گِڏيا، تِنِ چَيو، اڃهي ٿا اَچنِ
وڃين ولاتن ۾، جُڳَ ٿيا ڪي تِنِ
سَوين سُرهائيون لائيان، تَن ڪے ڪارڻ تِنِ
الاهي عنايت چوي، سيئي محب مِلَنِ
سَڀُ گهر هِيان تِنِ، ڳالهڙيون فراق جون

(محبوب کسی دور دراز سفر پر سمندر پار چلا گیا ہے۔ دن گذر گئے۔ مہینے نکل گئے۔ برس ہونے کو آئے، عاشق اپنے دل کو طفل تسلیاں دے رہا ہے اور اپنے سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

(منتیں مان رہی ہوں۔ پانی بھر بھر کر ہار رہی ہوں۔ خضر جو پانی کا بادشاہ اور خدا کی طرف سے پیر بنا ہوا ہے وہ ان کو سلامت یہاں تک لے آئے) پھر اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے کر کہتی ہے۔

جن کو وہ ملے ہیں وہی تو بتاتے ہیں کہ آ بھی ابھی آنے والے ہیں۔ بھلا دیکھئے تو سہی ان کو گئے ہوئے کتنے زمانے بیت گئے ہیں آنے کی خیر خبر سن کر میں اپنے تن بدن کو خوشبوؤں سے بساتی ہوں ان کو آنے تو دیجئے دیکھئے پھر میں کس طرح ایک ایک کر کے انھیں سناؤں گی

سیجڻ ھوا ڏور   مونکي منھن میڙیا

کچھ ادھر تھے کچھ دور چلے گئے تھے اور کچھ تو پار کر بھی پہنچ گئے تھے۔ لیکن جب بجلیاں چمکیں اور بنجر اور خشک میدان رنگین کھیت بن گئے تو چرواہوں نے اپنے چوپایوں کو واپس ان وادیوں کی طرف چلانا شروع کر دیا۔ میرے محبوب تو دور چلے گئے تھے لیکن خدا برسات کا بھلا کرے کہ پھر مجھ کو ان سے ملا دیا۔

سیّد صاحب نے اپنے کلام کو انیس[19] سُروں میں تقسیم کیا ہے اور پورے کا پورا کلام نازک خیالات اور تشبیہات و استعارات سے بھرا پڑا ہے۔ ایک آدھ شعر اور سنئے۔ مرنے والوں کو یاد کر کے کہا ہے کہ :۔

نکو خبر خواب نکو ونئي آئیو
ھتیجَن، ھتِیجَن ذي، مُکو کُونہ جَوابَ
ھَمیرَنِ حِسابُ، کُہ جاٹان کَھڙو ٿیو

(نہ کوئی خبر آئی اور نہ کوئی اونٹنی سوار قاصد حال لایا۔ نہ یہاں والوں کی طرف وہاں والوں نے کوئی خبر بھیجی۔ ان کے دکھ سکھ کی کوئی خبر نہیں۔ معلوم نہیں کہ ان جوان مردوں پر وہاں پہنچ کر کیا گذری)۔

پر اُن کے میدان بھی سیراب ہو گئے۔ نیز ساماروہ پر بھی بادل گھر گھر کر آئے بجلیاں بھی خوب چمکیں۔ وھیری بھی سیراب اور شاداب ہو گئی۔ ترائیاں سب کی سب پانی سے بھر گئیں۔ گھاس نکل آئی اور سبزہ لہلہانے لگا۔ اس کی مہک اور ہلکی ہلکی خوشبو سے فضا میں کیف پیدا ہو گیا۔ دلہار کے درختوں کے گھنے اور ٹھنڈے سایوں کو دیکھ کر عنایت کہتا ہے کہ آہ بس اب اس طرف چل پڑنے کے لئے جی مچل رہا ہے اور آنکھیں ان مناظر کو دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں)۔

لاڑ اور تھر سندھ کے دو ایسے خطے ہیں۔ جہاں نہریں وغیرہ نہیں ہیں۔جب بارش ہو جاتی ہے تو کھیت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔اور دلکش مناظر سے سرزمین نمونۂ فردوس بن جاتی ہے۔ خانہ بدوش قبیلوں کا گذارہ دودھ مکھن پر ہوتا ہے۔جب بارش کے بعد گھاس نکل آتی ہے اس وقت چرواہوں کی گائے بھینسیں بھی تر و تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت مختلف قبیلے جو ویرانی اور خشک سالی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر آکر اپنے پرانے تھانوں میں مل جاتے ہیں۔عنایت نے کہا ہے:۔

کبي اوس ۾ عنايت چوي ... ٿي پار ڪن، ڪي پور
وِجُون وَلهارين انيون ... پرچي پَٽِ خُضو رِ
ڏَٺو تن ڏٺ ڪاهيا ... سٺي اي مذڪور

پِيهَل پَتوهِيوُ ن تاڙي کَپَي تَنوارَ

هَارين هَرَ سنباهيا، سر هاتيا سنگهارَ

لاهي ڏُک ڏاتارُ الاهي عنايتُ چَوي

(تھر کے خطہ پر برساتیں برس کر چھٹ گئیں۔ سبزہ نکل آیا ہے۔ زمین پانی سے رچ گئی ہے۔ پپیہے اور پرندے چہچہا رہے ہیں اس وقت کی کیفیت شعر بالا میں بیان کی گئی ہے۔ یہ سماں دیکھ کر کاشتکاروں نے اپنے اپنے ہل سنبھال لئے ہیں اور عنایت کہتا ہے کہ اب تمام دُکھ دور ہو جائیں گے۔)

اُنوڏِٺ پِٽ پارڪر اَنم سار وسوار و

ميهن مور نه منيو ونگو ويچا ر و

اُناپٽ پُرا ڻ جا لڪڙي ساماڙو

وڏي ڳاله وَڏو ڻيو تهن مِهن مِموچا رو

وچڙين وري ڪيو تهن ڍلي تي دارو

تر ايون تار ڪيائين وَهيري وارو

تڏ اوٽ ولهار جا جت سڌر سونهارو

اڪڙ ين آ ر و اوڏاهين عنايت چوي

(پار کر پر بارش پڑی ہے، ڈھٹ اور پٹ پر بھی برس گیا

خیالات کی یکسانی اور دل آویزی - دوہوں کو شاہ لطیف کی طرح انہوں نے بھی مختلف سُروں میں تقسیم کیا ہے اور سندھ کی عشقیہ داستانوں کو شعر میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً عمر ماروئی۔ مومل۔ مینڈھرو لیلا چنیسر اور جام تماچی اور نوری کی حکایتوں کو بہت ہی دل نشین اور نتیجہ خیز انداز میں باندھا ہے ممکن ہے کہ انہیں کا تتبع شاہ لطیف نے کیا ہو ان کے شعر کا نمونہ یہ ہے۔

ساءِ سنبائي تون اُٿي	تَندون چورِ تنبورَ
مَنگڻھارا ہَلو ے اَگيان	ٿي وجا ئڻ وِير
دائِم اُهئي دَرَجي	جنهنين آهي هيرَ
تَن ڍِوٺي ڪَيا ڍير	خاصُ خزانن مان

(اپنے سازوں کو سنوار اور سنبھال کر اُٹھ۔ اُن کے تاروں کو چھیڑ اے مانگنے والے ضرورت مند اپنے شہنشاہ کے دربار میں فقط تار چھیڑنے کی دیر ہے۔ ہمیشہ جن کو اس کے دروازے پہ جانے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے بے شمار خزانوں کے انبار لگا دئے ہیں۔)

سُر سارنگ میں انہوں نے اپنے وطن کی خوشحالی اور فارغ البالی کی تعریف کی ہے۔ ایک جگہ بارش ہونے کے بعد مناظر کی دل فریبیوں کو یوں سراہا ہے۔

(۴) نعت میں، مناجات کے طور پر مسلسل اشعار کہنا بھی اس دور کے اولیات میں سے ہے جس کی ابتدا سرفراز خاں والیٔ سندھ نے کی اور مولود مخدوم عبدالرؤف بھٹی نے ایجاد کیا۔

(۵) پانچویں اور آخری خصوصیت یہ ہے کہ مذہبی عقائد اور فرائضِ اسلام نیز دیگر مذہبی چیزیں عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے نظم کا استعمال کیا گیا۔ جس کی ابتدا ابوالحسن نے کی اور مقدمۃ الصّلوٰۃ کے نام سے سندھی نظم میں سب سے پہلی کتاب لکھی۔ سندھی زبان کی یہ پہلی کتاب ہے اس کے بعد مخدوم محمد ہاشم۔ مخدوم ضیاء الدین وغیرہ نے اس کی تقلید میں اسی انداز پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔

اس دور کے چند باکمال شعرا اور مصنّفین یہ ہیں:۔

شاہ عنایت رضوی۔ (۱۱۶۰ھ) اس دور کی ابتدا شاہ عنایت اللہ رضوی بن سیّد نصیر الدین بن سیّد شاہ اسمٰعیل بکھری سے ہوتی ہے۔ ان کا خاندان بکھر کے صحیح النسب سادات میں سے تھا جو بعد میں سندھ کے مختلف اطراف میں پھیلا۔ سیّد صاحب نصرپور میں پیدا ہوئے۔ میر علی شیر قانع نے ان کا تذکرہ بہت ادب اور احترام سے کیا ہے۔ ان کا انتقال ۱۱۶۰ھ سے پہلے ہوا ہے۔ شاہ عنایت اور شاہ لطیف شعر میں ایک ہی راستہ پہ چلے ہیں۔ وہی زبان۔ وہی بندشیں اور وہی

ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ اس جدت کا سہرا شاہ عنایت اور شاہ لطیف کے سر ہے۔ جنہوں نے زبان کو نئے نئے مقامی الفاظ، محاوروں اور ترکیبوں سے مالا مال کر دیا۔ مثلاً عمر ماروئی کی داستان کو بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری کے سلسلہ میں اس خطۂ ملک کی ہر چیز کو بیان کیا گیا۔ اس طرح ملیر کے محاورے اور ملیر کی زبان کے الفاظ اور مختلف اشیا کے نام مثلاً وہاں کے درخت، پھول، گھاس، کھانے پینے، کپڑے چرند پرند وغیرہ بھی اس میں آ گئے۔ منظر کشی کے بھی وہ وہ کمال دکھائے گئے کہ بادیہ و شاید اور تھر کے کتنے ہی بدلتے ہوئے مناظر اس طرح لافانی ہو گئے ہیں۔

(۲) اس دور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اسلامی تصوف کے ساتھ ساتھ ہندو ویدانت کے فلسفہ کو بھی شعر میں باندھنے کی ابتدا کی گئی۔ روحل فقیر نے سب سے پہلے اس خیال کو اس دور میں ادا کیا۔ جس کو بعد کے دور میں سچل فقیر نے پروان چڑھایا۔

(۳) تیسرا اہم کارنامہ ہے وائی (کافی) جو اس دور کی مقبول ترین صنف کہی جا سکتی ہے۔ شاہ عنایت اور شاہ لطیف نے اس کو ایجاد کیا اور یہ دوہوں کے درمیان میں رکھ کر گائی جانے لگی۔ جس کی وجہ سے سندھی ادبیات کو چار چاند لگ گئے۔

شاعرانہ نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً کھٹی (دھوبی، جونیجہ، سید وغیرہ)
ایسے شعرا کا کلام بالکل سادہ، بے تکلف اور اپنے ماحول کا آئینہ دار ہے،
ان میں یا تو قبائلی افتخار کا ذکر ہے یا پھر اپنے دیہاتی ماحول کی زبان میں
عشق اور حسن کی باتیں کی ہیں۔

اس دور میں شاعری ذہنوں میں اس طرح رچ گئی تھی کہ ایک
ہی وقت میں شاہ عنایت شاہ لطیف اور مخدوم محمد زماں جیسے معیاری
اور بے مثل شاعر اکٹھے ہو گئے۔ اسی دور میں مخدوم ابوالحسن، مخدوم
ضیاء الدین۔ مولانا محمد ہاشم۔ مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی اور مخدوم محمد معین
جیسے باکمال علما اور مصنف سندھ کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ جنہوں
نے سندھی زبان میں اپنی تصانیف چھوڑ کر اسے ترقی یافتہ زبانوں
کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

اس دور کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:۔

(۱) دوہے کو تین مصرعوں کی بندش سے نکال کر ۷۔۸ مصرعوں
تک کی وسعت دی گئی اور ہر قسم کے مضامین اس میں باندھے گئے۔
دوہوں کو مختلف سروں میں تقسیم کر کے اس میں سندھ کی عشقیہ داستانیں
بیان کی گئیں۔ اگرچہ ارغون، ترخان اور مغل دور میں ان داستانوں کو
فارسی مثنویوں میں لایا گیا تھا۔ لیکن سندھی زبان کی شاعری میں ان کی

سندھ کے حکمراں سرفراز خاں کے سر ہے۔

شاہ لطیف نے دوسرے اصناف سخن کے ساتھ ساتھ مرثیہ پر بھی پہلی بار توجہ کی۔ انہوں نے اسے اپنے "سُر کیڈارو" میں باندھا ہے اور گو ہم اسے مکمل طور پر مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مرثیہ کے مضامین۔ مثلاً شہادت کے واقعات۔ اہل بیت کی بہادری اور تکالیف وغیرہ کو پہلی دفعہ سندھی شعر میں باندھا گیا اور یہ ایک بالکل نئی چیز تھی۔

اس دور میں شاعری کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ پڑھے لکھوں کے ساتھ سیکڑوں اَن پڑھ شاعر بھی ایسے ملتے ہیں جنہیں شعر اور زبان پر قابلِ رشک قدرت حاصل تھی۔ ان میں سے بعض کا کلام شاہ کے شعری سرمائے میں ملا دیا جائے تو فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ کتنے ایسے دیہاتی اور عوامی شعرا کا کلام شاہ کے کلام میں ملا ہوا پایا گیا ہے۔ جس کو کئی ایڈیشنوں کے بعد بڑی جستجو اور تحقیق سے الگ کیا گیا ہے۔ ان عوامی شاعروں کی فہرست طویل ہے اور ان میں قطب۔ شریف۔ سیّد۔ بلاول۔ بڈھو۔ لکھمی۔ قاسم۔ لطف اللہ۔ لکھمیر۔ کیسر۔ جونیجو۔ حبیب۔ ہلال۔ محمود۔ منگیل۔ شاہ حسین اور طالب وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ سب عوامی شاعر ہیں جن کا کوئی تخلص نہیں۔ بعض نے اپنا نام بطور تخلص کے اختیار کیا ہے اور بعض نے اپنے قبیلہ یا پیشہ کو

گیا ہے۔ حکومت مقامی نسل کے خاندان کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی زبان
سندھی تھی۔ لہٰذا انہوں نے پوری طرح اس کی پرورش اور سرپرستی کی۔
سرفراز خاں کلہوڑو خود سندھی کے بلند پایہ نعت گو شاعر تھے۔ سندھی
شعر میں نعت گوئی کی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

اس تمام عرصہ میں اگرچہ دفتری زبان فارسی رہی لیکن گھریلو اور
روزمرہ کی زبان سندھی ہی رہی جس کی وجہ سے سندھی شاعری کو
پھلنے پھولنے کے لئے وسیع میدان مل گیا۔ سیکڑوں شاعر پیدا ہوئے
جن کا سب کلام اگر محفوظ ہوتا تو سیکڑوں جلدیں ہو جاتیں۔ اس دور
کا عظیم الشان اور بے مثل شاعر شاہ لطیف ہے جس نے نہ صرف
زبان کو نئے الفاظ۔ محاوروں اور ترکیبوں سے مالامال کر دیا بلکہ
سندھی شعر کے محدود دامن کو نئے اسلوب، نئے مضامین اور گوناگوں
تخیلات سے بھر دیا۔ دوہوں کو محدود ماحول سے نکال کر وائی (کافی) کے
وسیع میدان کو خیالات کی جولان گاہ بنایا۔

اب تک سندھی زبان میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ اس
دور میں سب سے پہلی سندھی تصنیف "مقدمۃ الصلواۃ" کے نام سے
لکھی گئی اور اس کے بعد اسی دور میں کئی منظوم کتابیں تصنیف کی گئیں۔
مناجات (حمد اور نعت) بھی اسی دور کی ایجاد ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا

چوتھا باب

کلہوڑا دور کا سندھی ادب

۱۱۹۷ھ / ۸۴-۱۷۸۳ء		۱۱۳۱ھ / ۱۹-۱۷۱۸ء

یہ دور میاں نور محمد کی مسند نشینی (۱۱۳۱ھ) سے شروع ہو کر میاں عبدالنبی کے زمانے میں ہالائی کی جنگ (۱۱۹۷ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ جب کلہوڑوں کی حکومت کی بساط اُلٹ دی گئی اور پانسہ ٹالپوروں کے حق میں پڑا۔

نور محمد کے زمانہ میں سندھ کا کچھ حصّہ خود ہی دہلی کی مرکزی حکومت سے آزاد ہو گیا، اور باقی حصّہ کو مرکز سے ٹھیکہ پر لیا گیا۔ نادرشاہ کی آمد (۱۱۵۴ھ) کے بعد یہ ٹھیکیداری بھی ختم ہو گئی۔

یہ دور سندھی زبان اور اس کے ادب کے لئے عہد زرین مانا

کر رہے ہوں)۔

اکڙيون مليرم، جنين ر اتو ڏيه
عمر آسائش سين هاڻي کنديءَ ڪيئي

(جن کی آنکھیں رات دن ملیر کی طرف لگی ہوئی ہوں - اے عمر!
تو ہی انصاف کر وہ تیرے کس کام کی ہیں ۔)

عثمان احسانی ۔ (۱۰۵۰ھ) یہ شاعر مخدوم پیر محمد لکھوی کا ہم عصر تھا اور ۱۰۵۰ھ میں بھاگ ناڑی سے منتقل ہو کر لکھی میں آکر مقیم ہو گیا تھا۔ "وطن نامہ" کے نام سے ان کی ایک نظم ہے جس میں فنا اور بقا اور حیات بعد الممات کے مضامین مختلف پیرایوں میں بیان کئے ہیں اس وطن کو عارضی قرار دے کر اصلی وطن کو سراہا ہے ۔ یہ رنگ ہے ۔

اتي هلندي اوچتو	نه ڪهن پهرياٽ
ڪوڏهاڙ وآهين	دينا منجھ مهمان
جو ڏاڍو سفر موت جو	سڀجھي تو ستاڻ

(اس دنیا سے اچانک چل چلاؤ ہو گا۔ یہاں تو مہمان کی طرح عارضی قیام ہے ۔ اصلی وطن کی طرف جو سفر شروع ہو گا اس کا انتظام کرنا چاہیئے)۔

صلعم کی محبت میں انہوں نے بڑی والہانہ نعتیں کہی ہیں اور ان کے اشعار میں بلا کی آمد اور جوش ہے۔

شاہ عبدالکریم بلڑی۔ (۹۴۴-۱۰۳۲ھ) اس دور کا ایک اور بے مثل شاعر شاہ کریم ہے۔ پورا کلام تو ان کا بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ البتہ بیان العارفین" (تدوین ۱۰۴۴ھ) کے ذریعہ ۹۴ اشعار ہم تک پہنچے ہیں ان اشعار میں کئی الفاظ قدیم سندھی کے ہیں جو آج متروک ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عربی کے ۲۹ لفظ اور فارسی کے ۸ الفاظ ہیں شعر کا انداز بیان بے حد دلکش ہے۔

نيهُ نياپي نه ٿسٽي ، سڄين سيڻ نه هون
ڪارهيين راتين رت ڦڙا، جان جان نيڻ نه رُون

(محض تمنا اور آرزو رکھنے سے محبت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ پیغام ہی کچھ کام دے سکتے ہیں۔ جب تک کہ کالی راتوں کو جاگ جاگ کر آنکھوں سے خون کی ندیاں نہ بہائی جائیں)

ڪاٺيارين ڪئي ڪن ، عمر! اچا ڪپڙا
جن جا ڏرِ ٻڌ ، ور تنا ويڻ سهن

(اے عمر! آپ کی قید میں وہ کس طرح سفید کپڑے پہنیں۔ کس طرح بن سنور کر رہیں۔ جن کے سہاگ اپنے وطن میں طعنے برداشت

وہ پورا ہو کے رہتا تھا، (تحفتہ الکرام ج ۳ ص۱۷۴) افسوس ہے کہ ان کا کوئی شعر محفوظ نہ رہ سکا۔

مخدوم نوح ہالہ کنڈی۔ (۹۱۱-۹۹۸ھ) ہالہ کنڈی (موجودہ ہالا، ضلع حیدرآباد) کا یہ باکمال صوفی درویش اس دور کے ابتدائی عہد کا شاعر ہے۔ ان کے فارسی ملفوظات میں ان کے چند سندھی اشعار محفوظ رہ گئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے۔

پَئـي جا پر پات، سا ماک نہ پائينوماڻها
روئي چيري رات، ڏسي ڏکويِنِ کي

(بیتی ہوئی رات کے بعد صبح کو جو اوس پڑی ہوئی دیکھ رہے ہیں، وہ شبنم نہیں ہے بلکہ یہ وہ آنسو ہیں جو دکھے ہوئے دلوں کی کیفیت کو دیکھ کر رات نے گرائے ہیں)۔

نہ سِـي جو گِي جوءِ ۾، نہ سا سکي چاٽ
کا پڙينِ کَنوات، وڏيَ ويل پلاڻيا

(اپنے محبوبوں کو نہ دیکھ کر عاشقوں نے رات کے ابتدائی حصہ میں ہی اپنے اونٹوں کی باگیں سنبھال لیں)

مخدوم پیر محمد لکھوی۔ (۹۹۹ھ)۔ ان کا اصل خاندان ٹھٹھہ کا تھا لیکن کسی وجہ سے لکھی (قریب سکھر) کو وطن بنا لیا تھا۔ حضور نبی کریم

اس کے انتقال کے بعد براہِ راست آگرہ اور دہلی کے مرکز سے گورنر آتے رہے، جن کا سلسلہ میاں نور محمد کلہوڑہ[1] کی خود مختاری اور نادر شاہ کی آمد (۱۱۴۴ھ)[2] تک رہا۔

اس دور کی دفتری زبان فارسی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سندھی کا بھی ارتقا جاری رہا۔ صوفیائے کرام اور عوام دونوں نے اسے اپنایا، چنانچہ اس دور میں ہمیں سندھی کے کئی بلند پایہ شعرا ملتے ہیں، جنہوں نے شعر و سخن کے ذریعہ سندھی زبان کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شاہ کریم، سندھ کا ولیٔ کامل اور بے مثل شاعر اس دور کا تابناک ستارہ ہے، اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر آنے والے دور میں اس کے پوتے شاہ عبد اللطیف نے سندھی شاعری کو لافانی شہرت دے دی۔

راجو درویش۔ (المتوفی ۹۰۷ھ) اس دور میں سب سے پہلے راجو درویش کا نام آتا ہے "تحفۃ الکرام" کی روایت ہے، کہ یہ برگزیدہ بزرگ ہمیشہ جذب کی حالت میں رہتے تھے، پاؤں کو کبھی جوتوں کے بوجھ کی زحمت نہیں دی، جب کبھی جذب کی حالت پیدا ہوتی تو بہ آواز بلند اپنے سندھی اشعار گانے لگتے، اور ان اشعار میں جو کچھ کہہ دیتے،

---

[1] نور محمد نے ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی۔ "طوفان عظیم" سے تاریخ نکلتی ہے۔
[2] نادر شاہ ۱۱۴۴ھ میں سندھ میں آیا۔ "مثل قیامت" سے تاریخ نکلتی ہے۔

تیسرا باب

ارغون ترخان اور مغل دور کا ادب

۹۲۷ھ ۲۰-۱۵۲۱ء	——	۱۱۳۱ھ ۱۸-۱۷۱۹ء

سندھ کے فاتح شاہ بیگ ارغون کا دو سال بعد سندھ میں ہی انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا شاہ حسین ارغون ۹۶۲ھ تک حکومت کر کے لاولد فوت ہوا اور سندھ کی سلطنت اس کے دو امیروں میں تقسیم ہو گئی۔ ٹھٹھ کا علاقہ مرزا عیسیٰ ترخان کے حوالہ ہوا، اور بکھر کا صوبہ شاہ محمود کے حصہ میں آیا۔ میرزا عیسیٰ سے لے کر میرزا جانی بیگ (۱۰۰۰ھ) تک سندھ ترخانی قبضہ میں رہا تا آنکہ اکبر کے سپہ سالار خان خاناں عبدالرحیم خاں نے آکر اس کو فتح کیا، اور سندھ کی حیثیت ایک صوبہ کی سی رہ گئی۔ میرزا جانی کا لڑکا میرزا غازی ۱۰۲۱ھ تک بحیثیت گورنر کے یہاں رہا۔ لیکن

آکر سندھ کو فتح کر لیا۔ قاضی صاحب نے سمہ عہد کا اختتام اور ارغون دور کا شباب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بلکہ اس انقلاب میں انہوں نے بہت سے اہم کام بھی انجام دئے۔ انہوں نے دو سمہ حکمران دیکھے اور دو ارغون فاتح، جن کے نام یہ ہیں:۔

جام نظام الدین سمہ (۸۶۴-۹۱۴ھ) جام فیروز سمہ (۹۱۴-۹۲۷ھ) شاہ بیگ ارغون (۹۲۷-۹۲۸ھ) شاہ حسین ارغون (۹۲۸-۹۶۲ھ)۔

ہے، اور انہیں کی ڈالی ہوئی بنیادیں تھیں جن پہ آگے چل کر سندھی شعر نے اپنی عمارت کھڑی کی، کہتا ہے کہ:-

جوڳيُ جا ڳايوسِ، ستو هيس ننڊَ ۾
تهان پوءِ تيو سِ، سنڌيِ پريان پيچ ۾

(میں سویا ہوا تھا کہ پیرو مرشد نے آکر بیدار کیا، اسی کے بعد تو میں محبوب کی تلاش میں نکلا)

لوڪان صرف نحو، مون مطالع سپرين
سوئي پڙهيو سو پڙهان، سوئي سو حرف

(لوگ تو صرف و نحو کے درس میں مشغول ہیں، اور میں اپنے محبوب کے مطالعہ میں مصروف ہوں، وہی ایک حرف پڑھ کر پھر پڑھتا ہوں اور اسی کو باربار دہراتا رہتا ہوں)

ان کے سات شعر "بیان العارفین" کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ قاضی صاحب نے بہت کچھ کہا ہوگا۔ لیکن زمانے کی دستبرد نے وہ تمام سرمایہ ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی برباد کردیا۔

سمہ حکومت ویسے تو سنہ ۹۱۴ھ میں ہی زوال کے آخری زینہ تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن پورے طور پر اس کا اختتام تیرہ برس بعد سنہ ۹۲۷ھ میں ہوا۔ جب کہ شاہ بیگ ارغون نے قندھار سے دوسری مرتبہ

سڻ سڄڻ پرين جو، وانگي جي نه وڃن
ڪوڙي ڏي دعوا دوست جي ڪهاڙي ڪيڪن

(دوست کا بلاوا سن کر جو اس طرف نہیں جاتے ان کو کیا حق ہے کہ وہ محبت کا دعویٰ کریں) مخدوم صاحب نے یہ بلاوا سنتے ہی وہیں تڑپ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اس زرگر بچہ نے اس کے بعد ایک اور شعر پڑھا۔

سِسِي ڏِي سِيت جو ٿڙ ڪَهن پَرِ ڪلاڙن سين
مَرِ ٿاني مُنهن مَهوٽ، اڄ وُئِي لِي وَڍِ لهي[1]

مخدوم صاحب کی نعش حیدرآباد سے لے جا کر ان کے وطن ہالہ کنڈی میں سپرد خاک کی گئی۔ مخدوم صاحب نے جان دی۔ زرگر بچہ بھی مر کھپ گیا۔ وہ مجلس سماع بھی ختم ہوئی۔ لیکن یہ شعر اب تک اس واقعہ کی یاد دلانے کے لئے محفوظ رہ گئے۔

قاضی قاضن ۔ (المتوفی $\frac{\text{۹۵۸ھ}}{\text{۱۵۵۱ء}}$) قاضی قاضن بن ابو سعید بن قاضی زین الدین دربیلی کی شخصیت اس دور کے ادبیات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا شاعر ہے، جس کے سات اشعار نہایت صاف ستھرے، بامعنی اور دلکش زبان میں ہیں، انداز بیان بھی دلنشین

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳ ۔ ص ۱۲۸

ماموتی (ٹھٹھہ کے قریب) تھا۔ ان درویشوں کے زمانہ کا تعین نہیں۔ لیکن یہ بہر حال جام نظام الدین (۸۶۴ - ۹۱۴ھ) سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

هاڪ وهندو هاڪڙو ويهندي بَنڌ اروڙ

بهه، مڇي، ءِ لوڙهه، سمي ويندا سوکڙي

(ہاکڑا دریا میں طغیانی آئے گی اور اروڑ کا بند بھی ٹوٹ جائیگا ڈنٹل، دمپا گرڈھل اور مچھلی، سمہ حاکم کی طرف بطور تحفہ کے جائیں گے)۔

وَسي وَسي آرُ، جڏهن وهين ڦٽندو

تڏ ٻار وڃائو ٻار پنجين درمي وڪبو

(جب دریا اپنا رخ بدل دے گا اور قحط کی شدت بڑھ جائے گی اس وقت پانچ درموں میں بچہ بچہ فروخت ہونے لگے گا)[1]

مخدوم احمد بھٹی ۔ ایک روایت ملتی ہے کہ مخدوم احمد بھٹی (المتوفی ۹۳۰ھ) نے حیدرآباد میں ایک محفل سماع کے دوران میں کسی زرگر لڑکے سے یہ شعر سن کر جان دی۔

---

[1] یہ اشعاد برٹن نے اور ہیگ کی کتاب (THE INDUS DELTA COUNTRY) کے صفحہ ۱۲۵-۱۲۷ پر دئے گئے ہیں۔

واپس لی۔

شیخ اسحٰق آہنگر۔ شیخ حماد کے بعد "تحفۃ الکرام" میں شیخ اسحٰق کا نام آتا ہے۔ علی شیر قانع نے لکھا ہے کہ "شیخ بھریہ نیرون کوٹ (حیدرآباد) کا مشہور مجذوب بزرگ تھا اور اکثر ان کی زبان سے، شیخ اسحٰق آہنگر کے اشعار نکلتے رہتے تھے۔ سید عبدالقادر مصنّف "حدیقۃ الاولیا" کی روایت ہے کہ ایک دن میں نے شیخ بھریہ سے ان اشعار کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ شیخ اسحٰق آہنگر کے ہیں۔" (تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۷۹)۔ بھریہ درویش کا انتقال ۹۰۳ھ میں ہوا، اور وہ حیدرآباد کے متصل گنج پہاڑ کے دامن میں دفن ہوئے۔ ایک شعر ان کی طرف منسوب ہے۔

تیان مان جھرک، ویھان پرین جي چھپر تي

مان کرن ڈرک، بولي پاجھاري مون سين

("تذکرۂ لطفی ج ۱۔ ص ۲۳)

میں چڑیا بن کر محبوب کے چھاج پر بیٹھ جاؤں اور وہ مجھے وہاں سے اڑانے کے لئے "ڈرک" کہیں۔ میں اس طرح ان کا تخاطب حاصل کر لوں اور ان کی آواز سن لوں۔

ماموئی کے معمے۔ اسحٰق کے بعد ماموئی کے سات معمے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہ سات شعر سات درویشوں نے کہے تھے جن کا مسکن

یہ دوہے نہ صرف اس دور کی شاعری کا نمونہ ہمیں دکھاتے ہیں
بلکہ ان کے ذریعہ ہمیں سندھیوں کے رسم و رواج، قبائلی خصوصیات اور
ان کی نفسیاتی کیفیت کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

سمہ عہد تک سندھ میں سندھی شاعری عام ہو چکی تھی۔ اس
دور میں کئی مشہور شاعر پیدا ہوئے جن کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔

شیخ حماد بن رشید الدین جمالی ۔ انہیں میں شیخ حماد بن
رشید الدین جمالی جیسی برگزیدہ اور درویش صفت ہستی بھی تھی۔ ٹھٹھہ
کے قریب ساموئی میں ان کا تکیہ تھا۔ حکومت سندھ کے حقیقی ورثاء
جام تماچی اور صلاح الدین دہلی میں قید تھے اور ان کے بجائے سندھ
کی باگ ڈور جام جونہ کے قبضہ میں تھی۔ شیخ حماد کی ہمدردی حقیقی
ورثاء کے ساتھ تھی۔ چنانچہ ایک دن جذب اور جوش میں آکر انہوں
نے چند دعائیہ اشعار کہے جو فوراً سندھ میں پھیل گئے اور لوگوں نے
ان اشعار کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد صلاح الدین اور تماچی
دہلی سے آزاد ہو کر واپس آگئے اور آکر حکومت کا قبضہ جام جونہ سے
لیا۔ (تحفتہ الکرام ج ۲ ص ۱۸۲-۱۸۳)

اگر تحفتہ الکرام کی یہ روایت صحیح ہے تو ان اشعار کی تاریخ ۷۷۰ھ
ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اسی سال جام تماچی نے جام جونہ سے حکومت

چہ میگوئیاں ہوئیں کہ یہ لڑکا جو ایک عورت کے مشورہ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا کیونکر حکومت کا کاروبار چلائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے بجائے اس کے چھوٹے بھائی دودے کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس پر ان دونوں بھائیوں میں لڑائی چلی۔ دہلی کی حکومت سے امداد لی گئی اور سندھ کے تمام قبیلے اور سردار اس خوں ریز لڑائی میں مبتلا ہو گئے۔ اس پوری داستان کو اس زمانے کے شعرا نے سندھی دوہوں میں باندھا ہے اور کئی دوہے اب تک محفوظ ہیں۔ چند شعر یہ ہیں۔

ويھ پيءَ تان پيءُ جي، آءُ چنيسر آءُ !
پاڳ سائو تهنجو، تو کي پلي جيئوماءُ

سرداروں نے کہا کہ اے چنیسر تمہیں تخت مبارک ہو تخت پہ بیٹھ اور اپنے باپ کی مسند کو مزین کر۔ ایسی مائیں مبارک ہیں جو ایسے لڑکے پیدا کریں۔ چنیسر نے جواب دیا۔

آئين سعيو ڪريو سپاهجو، ته گهمي اچان گهر
وڏي جا ورهن جي، پڇي اچان تنهن ماءُ

آپ لوگ تخت نشینی کا انتظام کریں اس اثنا میں میں ذرا جا کر والدہ سے مشورہ کر آؤں جو کہ سن رسیدہ اور بڑی عقلمند اور تجربہ کار ہیں۔

یہ سندھی شعر معلوم نہیں کیا تھا۔ عربی دانوں نے صوتی اعتبار سے کیا سمجھا اور کس طرح نقل کیا۔ پھر فارسی تاریخوں نے اس کو کس طرح اپنایا۔ بہرحال یہ سب سے قدیم سندھی شعر ہے جو اب تک دستیاب ہوا ہے۔

سومرہ خاندان (۱۰۵۱-۱۳۵۱ء) کے حاکم مقامی نسل کے تھے۔ ان کی اپنی زبان سندھی تھی۔ عربوں کی وجہ سے اگرچہ تین ساڑھے تین سو برس تک عربی زبان کا عمل دخل رہا۔ لیکن نئے حاکموں کی وجہ سے یک لخت سندھی زبان کو ترقی کرنے اور بڑھنے کے مواقع میسر آ گئے۔ چنانچہ موجودہ سندھی کی نشوونما اسی دور میں ہوئی اور اس میں عوامی گیت، رزمیہ داستانیں، قومی برتری اور قبائلی چشمکوں کی کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ "دودے چنیسر" کا قصہ اسی دور کی یادگار ہے۔

دودے چنیسر کا قصہ۔ بھونگر (۱۳۱۲ء) کے دو بیٹے تھے غیر کفو سے چنیسر اور اپنے قبیلہ سے دودا۔ والد کے انتقال کے بعد دونوں لڑکوں کے درمیان حسب دستور رسہ کشی شروع ہوئی۔ سومرہ سرداروں نے چنیسر کے حق میں فیصلہ کیا۔ جب اس کو اطلاع دی گئی تو اس نے کہا کہ میں اپنی والدہ سے مشورہ کر لوں کہ تخت لوں یا نہ لوں۔ سردار اور امرا بڑے مایوس ہوئے اور

تھی کہ اس میں کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں۔ جیسا کہ بزرگ بن شہریار کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا خط کیسا تھا۔ زبان کس طرح کی تھی۔ اس کے متعلق نہ کوئی نمونہ ہے اور نہ کوئی شہادت۔

سندھی شعر کا قدیم نمونہ:۔ سندھی زبان کا سب سے قدیم شعر جو ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ فضل بن یحییٰ کی مدح میں کہا گیا ہے اور اتفاق سے بعض عربی اور فارسی تاریخوں میں محفوظ رہ گیا ہے۔ (روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء مجمل التواریخ) اس کی صورت اور الفاظ اگرچہ بگڑ چکے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی وزن اور قافیہ اس میں موجود ہے۔

مجمل التواریخ سنہ ۵۲۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "د' مردے از زمین سندھ پیش وے (فضل بن یحییٰ برمکی تولدے رجب ۱۴۸ھ وزارت سنہ ۱۸۰ھ انتقال ۵ محرم سنہ ۱۹۳ھ) آمد و بزبان خویش یک بیت انشا کرد و بگفت۔ و آن این بود۔

ارہ برہ کنکرہ کرا کری منرہ

جب فضل نے اس بیت کے معنی پوچھے تو ترجمان نے یہ عربی کا شعر پڑھا۔

وَاِذَا الْمَكَارِمُ فِيْ آفَاقِنَا ذُكِرَتْ فَاِنَّمَا بِكَ فِيْهَا يُضْرَبُ الْمَثَلُ

(ترجمہ:۔ جب ہمارے پاس نیکیوں اور اچھائیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس وقت تمہارا ہی نام لیا جاتا ہے)[۵]

[۵] مجمل التواریخ طبع طہران ۳۴۳۔ البرامکہ عبدالرزاق ۳۹۵ بحوالہ ضیا برنی در روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء

دوسرا باب

سندھی زبان کا ادب

(عربی عہد سے لے کر سومرہ اور سمہ عہد تک)

عربوں کی فتوحات سے لے کر سموں کے عہد تک کا دور تقریباً آٹھ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پورے دور کے لئے ہمارے پاس سوائے چند منتشر اوراق کے کوئی تاریخی سرمایہ موجود نہیں۔ لے دے کر ایک "چچ نامہ" ملتا ہے۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی تمام روایات پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں سندھی ادبیات کے متعلق کسی مواد کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ جو کچھ منتشر شواہد دستیاب ہوئے ہیں، ان سے ہم صرف یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عربی دور میں سندھی زبان موجود تھی۔ لکھی پڑھی جاتی تھی اور وہ اس قابل بھی ہوگئی

مامم (عمہ) عاتی (قاطع) بیانو (بیعانہ) ساٹفان (ضعیفہ)
بصر (بصل) ثوم (فوم) آجکو (آزوقہ) تلھو (طل) پوتی
(فوطہ) آکرو (عاکرہ) نٹ (نطع) سلوار (سراویل) قنبر (قنبر)
گاشو (غاشیہ) مھاڈو (محاذ) قکڑ تال (فکر تعال) پتیری
(فیتری) کاسو (کاسہ) متہکو (مطرقہ) ھلواٹ (حلوان)
کاپارو (قبالہ) پوک (بوق) رٹو (رداء) گبجہ (قز)
تباک (طبق)۔

اسی طرح فارسی اور انگریزی کے بھی کئی الفاظ بگڑ کر سندھی
صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً پھراٹ (پیرہن) سراوان (ساربان)
آھینو (آئینہ) انگریزی کے :- باناقار (بوناپارٹ) دانواجول
(ڈونڈل) وغیرہ وغیرہ۔

اور سندھی ہے۔"

نویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی بعض کتابوں میں سندھی کے جو اشعار پائے جاتے ہیں۔ وہ عموماً خط نسخ میں لکھے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ امر قرین قیاس ہے کہ سندھی زبان کا یہ خط تقریباً آٹھ سو برس پہلے عربی نسخ رہا ہوگا۔ انگریزوں نے اس عربی نسخ کو برقرار رکھتے ہوئے خاص سندھی اداروں کے لئے نقطوں کے ہیر پھیر سے چند الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح صوتی اعتبار سے جو پہلے دقت محسوس ہوتی تھی وہ دور ہو گئی۔

سندھی زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات

جہاں تک سنسکرت اور پراکرتوں کے اثر کا تعلق ہے۔ اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مسلمانوں کی فتح سندھ کے بعد سے یہاں عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور مغلوں وغیرہ کی بکثرت آمد رفت رہی۔ اور تقریباً ایک ہزار برس یہ ملک ان کے زیر حکومت رہا۔ لہٰذا عربی فارسی کا اس زبان پر کافی اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اس زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے۔

بعض الفاظ اپنی اصلی صورت چھوڑ کر سندھی بن چکے ہیں مثلاً تائیت (تعویذ) وتو (وطاء) بدک (بطخ) سترھ (شراع)

تقریباً ایک ہزار برس گذر چکے ہیں۔

مسلمانوں کی سندھ میں آمد کے بعد یہاں صرف دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک سندھی جو ملکی زبان تھی اور دوسری عربی جو حکومت کی زبان تھی۔ چنانچہ عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں پورے ملک سندھ میں سندھی زبان رائج تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب دیلمیوں کا عروج ہوا اور اس کا اثر سندھ پر پڑا تو یہاں فارسی زبان بھی رائج ہوئی۔ چنانچہ ملتان میں جو حکومت سندھ کے ماتحت تھا۔ سندھی اور عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کے رواج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۳۷۵ھ کے قریب بشاری مقدسی جب ملتان آیا تو یہاں فارسی زبان کو مروج پایا۔ مورخ مسعودی لکھتا ہے کہ سندھ کی ایک خاص زبان ہے جو ہندوستان سے الگ ہے۔ منصورہ کے تاجر سندھی اور عربی ہی کے ذریعہ اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ بشاری دیبل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہاں سبھی تاجر بستے ہیں۔ ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔ اصطخری کا بیان ہے کہ ملتان کے لوگ فارسی اور سندھی بولتے ہیں۔ اسی طرح جیسی منصورہ میں بولی جاتی ہے۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ "منصورہ۔ ملتان اور دوسرے شہروں کی زبان عربی

صوبہ سندھ کی لسانی تاریخ کا دوسرا دور ۶۰۰ ق۔ م سے ۷۰۰ عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مہایانا بدھ مت کو عروج حاصل ہوا اور کنشک نے پالی پراکرت کے ذریعہ اس کا دُور دُور تک پرچار کرنا شروع کیا۔ چونکہ سندھ بھی اس کی قلمرو میں شامل تھا۔ اس لئے یہاں بھی پالی پراکرت کا کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہو گا۔ چونکہ کشن خاندان کا سندھ پر سیاسی اقتدار زیادہ عرصہ تک نہیں رہا۔ اس لئے پالی کی بہ نسبت یہاں کی زبان پر ایرانی، یونانی، ترکی اور دراوڑی الفاظ زیادہ غالب رہے۔ ان وجوہ سے سندھ کی بولی دوسری پراکرت بولیوں سے بالکل مختلف ہو گئی۔ اس لئے یہاں کی بولی کو ورچیڈا اپبھرنش یعنی بالکل بگڑی ہوئی زبان قرار دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں کی رائے میں سندھی کا بنیادی دور ۷۰۰ عیسوی سے ۱۲۰۰ عیسوی تک سمجھنا چاہیئے۔ اسی میں موجودہ سندھی کی تشکیل ہوئی۔ ہم قطعی طور پر تو نہیں۔ لیکن ظنی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ عرب حکومت سے پہلے سندھی زبان کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ اور اس کی مختلف اقسام سندھ کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھیں۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ سب کس زمانے میں رائج ہوئیں ؛ موجودہ سندھی کی تشکیل سمرا کے عہد (۱۱ ویں صدی عیسوی) میں ہوئی جس کو

آگے دھکیل دیا۔ اس طرح دو بڑے منطقے ظہور میں آئے۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ دوسرا منطقہ کشمیر اور شمال مغربی پنجاب سے لے کر سندھ تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے اس کی بولیاں کشمیری، مغربی پنجاب اور سندھی، دوسرے علاقوں کی بولیوں سے مختلف ہیں، یہ نظریہ ایسی صورت میں ناقابلِ قبول ہے۔ جب سندھی کو آریائی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن بعض اہم وجوہ اس سلسلہ میں سدِّ راہ ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ یہ امر کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ سندھ میں بہت قدیم زمانہ سے کوئی سامی بولی رائج تھی۔ جو لوگ سندھ میں پہلے پہل آباد ہوئے وہ مغربی ملکوں سے آئے تھے اور انہوں نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ موئن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ موئن جو دڑو کی زبان اور قدیم سُمیری زبان میں کچھ تعلق ہو۔ بدقسمتی سے اب تک موئن جو دڑو کے رسم الخط کو پڑھا نہیں جا سکا اور اس لئے یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اس زبان کے نشان ہمیں موئن جو دڑو کی مہروں اور کتبوں سے ملتے ہیں۔ سندھ کی اس قدیم ترین زبان کا زمانہ تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔

کا اثر بڑھتا گیا۔ مغربی ہند میں پنجابی، سندھی، گجراتی اور راجستھانی اسی پراکرت کی مختلف صورتیں ہیں۔

جہاں تک سندھ کا تعلق ہے یہاں کی عام بول چال کی زبان کا نام ورچڈا بتایا جاتا ہے۔ اس سے چار سندھی بولیاں پیدا ہوئیں جو علاقائی لحاظ سے چار شاخوں میں منقسم ہیں۔

(۱) وچولی، جو وسط سندھ میں بولی جاتی ہے۔

(۲) سرائیکی یا سرلی جو سندھ کے مشرقی حصہ میں بولی جاتی ہے۔ جس میں بہاولپور کا علاقہ بھی گنا جاتا ہے۔

(۳) تھرلی۔ جو تھرپارکر کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔

(۴) کچھی، جو کچھ اور کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں رائج ہے۔

خاص سندھ میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ وچولی ہے اور یہی موجودہ سندھی ہے۔

اتنا ظاہر ہے کہ دوسرے علاقوں کی طرح سندھ میں بھی آریاؤں کی آمد سے پہلے کوئی مقامی بولی رائج ہوگی۔ اگرچہ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ وہ بولی کیا تھی۔ بعض مغربی محققوں کا خیال ہے کہ آریا قوم کے گروہ اور قبیلے یکبارگی اس برصغیر میں داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ مختلف وقفوں سے آئے۔ بعد میں آنے والوں نے اپنے پیش روؤں کو

رہا۔ جب ۳۲۹ ق۔ م میں سکندر اعظم فتح ایران کے بعد یہاں داخل ہوا تو سکندر کی واپسی کے بعد یہ صوبہ موریا خاندان کی سلطنت کا جزو بن گیا اور بعد میں باختر کے یونانیوں کا یہاں تسلط رہا پہلی صدی سے ساتویں صدی قبل مسیح تک وسط ایشیا کے مختلف فاتحین کے گروہ اور قبائل یہاں آتے رہے۔ یہاں تک کہ بنی اُمیّہ کے عہد میں محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ کے ساحلی شہر دیبل کو فتح کر لیا اور ملتان تک فتح کر کے یہاں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت سے ۱۲۰۰ سال تک سندھ مختلف مسلمان خاندانوں کے زیر حکومت رہا ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے اس پر قابض ہو کر اسے ایک صوبہ کی حیثیت سے برطانوی ہند کی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اب یہ پاکستان کا ایک صوبہ ہے۔

سندھ کی قدیم زبانیں۔ اس برّصغیر کی زبانوں کی داستان بھی اس کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ آریا پہلے پہل پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے تھے اور یہاں سے انبالہ کے راستے مرکزی ہند میں پہنچے تھے جہاں سے وہ برّصغیر کے مختلف حصّوں میں پھیل گئے۔ سندھ میں ان کی زبان نے مقامی اثرات قبول کیے۔ جوں جوں وہ سندھ سے آگے بڑھتے گئے۔ ان پر کول اور دراوڑوں کی زبانوں

پہلا باب

سندھی زبان کی تاریخ

سندھ کی قدامت - تاریخی اعتبار سے صوبہ سندھ نہایت قدیم ثقافتی ورثہ کا مالک ہے۔ موئن جودڑو کے آثار قدیمہ جو اس سرزمین میں پائے جاتے ہیں وہ محققین کے نزدیک آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے کے ہیں اور سُمیری تمدن اور مصر کے قدیم ترین عہد کے تمدن کے ہم عصر سمجھے جاتے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح میں آرین قوموں کے قبیلے اور گروہ وسط ایشیا یا کسی اور مقام سے نکل کر وادیٔ سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ہخامنشی بادشاہ دارا نے اسے فتح کر لیا اور ایک مدت تک یہ صوبہ ہخامنشی فرماں رواؤں کے زیر حکومت

فہرست

۱ - سندھی زبان کی تاریخ ۷

۲ - سندھی زبان کا ادب ۱۵

۳ - ارغون، ترخان اور مغل دور کا ادب ۲۵

۴ - کلہوڑا دور کا سندھی ادب ۳۲

۵ - ٹالپوری عہد کا سندھی ادب ۶۲

۶ - عہد برطانوی کا ادب ۸۲

۷ - موجودہ پاکستانی دور ۱۰۲

۸ - سندھی کی اصناف سخن ۱۰۸

سندھی ادب

Rashidi, Hisam al-Din
Sindhi adab

سندھی ادب

پیر حسام الدین راشدی

ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی

قیمت بارہ آنے (۱۲)

سندھی ادب